۱

فارسی کہانیاں

انتخاب اور ترتیب

نیر مسعود

اسماعیل فصیح

بابا مقدم

جمال میر صادقی

شین پرتو

صادق ہدایت

غلام حسین ساعدی

فریدون تنکابنی

فریدہ رازی

محسن دامادی

منوچہر خسروشاہی

ترجمہ:

نیر مسعود

انتخاب اور ترتیب

نیر مسعود

فارسی کہانیاں ۔ ۱

فارسی کہانیاں ۔ ۱

انتخاب اور ترتیب:
نیر مسعود

پہلی اشاعت (''ایرانی کہانیاں'' کے عنوان سے): 2002
دوسری اشاعت: 2013

زیرِ اہتمام
آج کی کتابیں

طباعت: ذکی سنز پرنٹرز، کراچی

سٹی پریس بک شاپ
316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی 74400
فون: 35213916 - 35650623 (92-21)
ای میل: ajmalkamal@gmail.com

ترتیب

اسماعیل فصیح

بابا مقدم

جمال میر صادقی

شین پرتو

اسماعیل فصیح

خواب

1

رات کے اندھیرے میں مجھے ایک خواب دکھائی دیتا ہے کہ میں نے اپنے ایک ہم شکل کو قتل کردیا ہے، یا اپنے ہم زاد کو قتل کر دیا ہے۔ کسی جگہ، آئینے کے سامنے، میں نے چھرے کا پھل اس کے گلے میں اتار دیا ہے۔ خون کا فوارہ ابلتا ہے۔ وہ ایک چیخ مارتا ہے۔ آہستہ سے پھڑ پھڑاتا ہے۔ اس کے ہاتھ اٹھنے کے اٹھے رہ جاتے ہیں۔ وہ چھرے سے چھوٹ کر زمین پر گرتا ہے اور دم توڑ دیتا ہے۔

میں اس کو خون میں لتھڑے ہوئے بالوں سے پکڑ کر، نیم تاریک راہداری کے سرد پکے فرش پر گھسیٹتا ہوا، ویران مکان میں سے، تاریکی میں سے، یادوں میں سے، آرزوؤں میں سے گھسیٹتا ہوا، قلبِ شب تک لے آتا ہوں۔ رات برہنہ اور بے امان ہے۔ اور میں اس جسد کو باغ کی پشت کے کھنڈر میں بڑی احتیاط کے ساتھ ایک گندے گڑھے میں ڈال دیتا ہوں۔

میری مٹھی میں جکڑے ہوئے خون آلود چھرے سے اب تک لہو ٹپک رہا ہے۔ اور لاش کی پتھرائی ہوئی آنکھیں میرے درونی غصے اور کینے کا شکار ہو کر خاموش پڑی ہیں۔

لاش کو گڑھے میں ڈال کر میں اندھیاری میں کھڑا رہتا ہوں اور خاک پر پڑے ہوئے بے جان بدن سے کہتا ہوں:

''تو نے میری زندگی برباد کردی۔ میری بڑی سے بڑی تمنا کو خاک میں ملا دیا۔ میرے خوابوں کو، میری چاہتوں کو، اور میرے ہر ہنر اور ہر خوبی کو ملیا میٹ کر دیا۔''

میں یہ کہتا ہوں اور لاش کی آنکھ کے ڈھیلے میں چھرا بھونکتا ہوں۔ کب سے جمع ہوتے

ہوے کینے اور غیظ وغضب کے ساتھ چھرا اور اندر اتارتا ہوں اور دھاردار فولاد سے آنکھ کی پتلی، حدقے، جمتے ہوے خون، گوشت کے ریشوں، نسوں، ہڈیوں کو کاٹتا چلا جاتا ہوں اور مغز تک، جسمانی ذلالتوں کے مرکز تک، اور زمین کی مٹی تک، چھرا اُتار دیتا ہوں۔

پھر احتیاط کے ساتھ لاش پر پٹرول چھڑکتا ہوں۔ اسے آگ دکھاتا ہوں۔ جلا کر راکھ کرتا ہوں اور راکھ کو فضا میں منتشر کر دیتا ہوں۔

2

جھٹ پٹے کا سماں ہے۔ میں سرخ شراب کا جام ہاتھ میں لیے، ہلکا پھلکا، برہنہ اور تنہا، ٹب کے گرم پانی میں پھیل کر لیٹ جاتا ہوں۔

سوتے جاگتے میں خواب دیکھتا ہوں کہ اپنے ہم زاد سے اب تک باتیں کر رہا ہوں۔ اس سے کہتا ہوں:

"کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ تو کرنا ہی تھا۔ میں اس عذاب کو ختم کرنے پر مجبور ہو گیا تھا، ورنہ، اگر یہ نہ کرتا تو میری اور تیری مسلسل جاں کنی کبھی ختم ہونے میں نہ آتی۔ چلتی رہتی، برسوں چلتی رہتی، یہاں تک کہ ہم، دو فرتوت بوڑھے، ایک دوسرے کا ماتم کرنے بیٹھ جاتے اور میری تیری زندگی میں سے ایک گدلی بدرنگ سیاہ تلچھٹ کے سوا کچھ نہ رہ جاتا۔ لیکن اب تو آزاد ہے، میں بھی آزاد ہوں۔ ہم ایک دوسرے کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی اصل کو پا لیا ہے۔"

3

برہنہ اور تنہا، ٹب کے گرم چپچپے پانی میں پڑا ہوا، میں خواب دیکھتا ہوں کہ سچ مچ میں آزاد ہوں۔ اس جسم سے رہائی کا احساس میرے اندر موجیں مار رہا ہے۔ میں اوج پر پہنچ رہا ہوں۔ امنگیں میری روح کو پھر سے زندہ کر رہی ہیں۔ دائمی آزادی کے اس کیف اور سرمستی نے مجھ کو نہ صرف میرے ہم زاد سے آزاد کیا ہے بلکہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں خود اپنی بھی داستان، اپنی بھی تاریخ سے الگ ہو گیا ہوں۔

ٹب کے گرم ساکت پانی میں پڑے پڑے اب میں یہ خواب دیکھتا ہوں کہ جس نے میرے ہم زاد کا خون کیا ہے وہ میں نہیں ہوں، کہ میں ایک موہوم اور اپنا من گڑھت وجود ہوں، کہ میں رمز و تخئیل کی خلق کی ہوئی ایک حسین لا فانی روح ہوں۔

لیکن صبح ہوتے ہوتے، اور کھڑکی کے اُدھر زندگی کی آوازوں کے ساتھ، خواب اور بیداری کے درمیان مجھے اپنا سر گھومتا معلوم ہوتا ہے۔ میں آنکھیں کھولتا ہوں اور مجھ کو حمام کی چھت اور دیواریں ناچتی دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کہیں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جا رہا ہوں۔

اور اب مجھ کو راہداری میں اُن کے قدموں، اُن کے بھاری بوٹوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

4

حوالات میں طول طویل جرحوں اور اقبالی بیان کے بعد، جب مجھے کوٹھری میں بند کر کے سب چلے جاتے ہیں، میں لکڑی کی بنچ پر پڑے پڑے گہری نیند سو جاتا ہوں اور خواب دیکھتا ہوں کہ درحقیقت میں نے کسی کا خون نہیں کیا ہے، کسی کو انگلی بھی نہیں چھوائی ہے، سوا اپنے۔ وہ میں تھا، اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو قتل کیا ہے، ایک لحظے میں، اس ایک لحظے میں جب میں آئینے کے اندر تھا اور آئینے نے مجھ کو اشارہ کیا تھا، میں نے چھرا اپنے گلے میں اتار دیا تھا، اور باہر کھینچ لیا تھا، اور پکار کر اپنے بدن سے کہا تھا:

''تو نے سب کچھ تہس نہس کر دیا۔ یہ تیری پھٹی پھٹی بھوکی آنکھیں، یہ تیرے پیٹ سے بھی زیادہ بھوکا تیرا دل، یہ تیرے بھوکے ہاتھ، یہ تیرے بیہودہ گو ہونٹ، یہ تیری چھوٹی چھوٹی خود پرستیاں اور اوچھی حرکتیں، ان سے تو نے سب کچھ ملیا میٹ کر دیا۔ جس شے میں بھی حسن کی رمق تھی تو نے اسے مٹا دیا۔''

اور میں نے اپنی گردن کی ایک ایک نس پر، پیشانی پر، چہرے کے عضلات پر، چھرا چلا دیا اور اپنی جان لے لی، پھر ہلکی سی تھرتھراہٹ کے ساتھ آئینے سے الگ ہوا اور زمین پر گر گیا۔ بس لمحہ بھر کی بات تھی۔

تنہا، حوالات کے ایک گوشے میں، میں خواب دیکھتا ہوں کہ میرا دم ذرا ذرا کر کے نکل رہا ہے اور دل کی آخری دھڑکنوں کے ساتھ میری روح آزاد اور سبک بار ہوجاتی ہے اور میرے سکڑے ہوئے بے بس بدن کو فنا کے مکڑ جال میں الجھا کا الجھا چھوڑ دیتی ہے، اور مجھے معلوم ہے کہ اب میں اس ذلیل منحوس بدن میں واپس نہیں آؤں گا۔

5

رات کو بلدیے کے ہسپتال میں، میں خواب دیکھتا ہوں کہ میں پہلے کی طرح ہوگیا ہوں۔ میں اپنے گھر، اپنی بیوی اور بچے کے پاس لوٹ آیا ہوں۔ کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ قتل، گرفتاری، جرح، حوالات، کچھ بھی نہیں۔ زندگی ہمیشہ کی طرح ہے۔ میں دن بھر کا تھکاہارا کام پر سے واپس آیا ہوں۔ گاڑی گیرج میں مقفل کردی ہے۔ رات ہوگئی ہے۔ میں نے پیٹ بھر کر کھا پی لیا ہے۔ اپنے کمرے میں کتابوں کے درمیان اکیلا بیٹھا ہوں۔ دوسرے کمرے سے ٹیلی ویژن کی آواز آرہی ہے۔ ہمیشہ کی طرح میرے ہاتھ میں کتاب ہے۔ پڑھ بھی رہا ہوں، نہیں بھی پڑھ رہا ہوں۔ اور وہ، جو میرا ہم شکل تھا، یا میرا ہم زاد تھا، اور میرا دشمن تھا، دیواری آئینے میں سے مجھ کو دیکھ رہا ہے، مجھے اشارے کررہا ہے۔ کھڑکی کے پیچھے سے اشارے کررہا ہے، کچھ غصے میں، کچھ تمسخر کے ساتھ، اور میں اس کی وہی لعنتی آواز سنتا ہوں جو سرد زمستانی ہوا میں میری روح کے اندر سے اٹھا کرتی تھی، اُس شخص کی آواز جو میرا عدو تھا، آواز جو میری روح کو کھرچتی رہتی تھی۔ وہ رات کی کھڑکی میں سے مجھ پر ہنستا ہے۔ میں اسے دیواری آئینے میں دیکھتا ہوں کہ مجھ پر ہنس رہا ہے۔ اور آج رات میں اس کو بہت احتیاط کے ساتھ اشارے سے بلاتا ہوں، دروازے کا کھٹکا کھول دیتا ہوں اور اس کا انتظار کرتا ہوں۔ اسے دیکھتا ہوں کہ دروازہ کھول کر آہستہ آہستہ کمرے میں آرہا ہے۔ ہم میز پر آمنے سامنے بیٹھتے ہیں، ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہیں۔ میں نفیس شراب کی طرف کانپتا ہوا ہاتھ بڑھاتا ہوں، وہ کھانا اپنی طرف کھسکاتا ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ یہاں میرے اس کے مابین جو کچھ بھی ہے اس کا مقدر فنا ہے... اور میرا ہاتھ چھرے کی طرف بڑھتا ہے۔

6

مقدمے کا دن۔

مقدمے کے دوران، بعد ظہر کی بے کیف گھڑیوں میں، عدالت کے تپتے ہوئے کمرے میں وکیل دفاع، وکیل سرکار اور جج کی سپاٹ آوازوں، مقدمے کی لامتناہی اور پوچ بحثوں کے درمیان، میں دھوپ کی عینک کے پیچھے آنکھیں موند لیتا ہوں اور خواب دیکھتا ہوں کہ مجھ کو شہر کے میدانِ میں ننگا کر کے پھانسی پر الٹا لٹکا دیا گیا ہے۔ پھانسی کا تماشا دیکھنے آئے ہوئے لوگوں کو میرا الٹا، بے ڈھنگا بدن نظر آ رہا ہے۔ موت کی نیند میں مجھ کو جج کی آواز سنائی دیتی ہے:

''تم نے ایک بے گناہ آدمی کا خون کیا، اس کی لاش جلا دی، اس کی راکھ اڑا دی، اور دعویٰ کرتے ہو کہ وہ تمھارا اپنا بدن تھا، اور تم نے سب کچھ اس کے بھلے کے لیے کیا تھا۔ کون تھا وہ آدمی؟ اسے جینے کا حق نہیں تھا؟ کیا نام تھا اس کا؟''

میں سر ہلا دیتا ہوں۔ میں نے اپنے نام، اپنی زندگی، اپنی تاریخ سمیت اپنے آپ کو گڑھے میں ڈال کر پھونکا تھا۔

7

پھانسی سے پہلے والی رات۔

میں اپنی تنہا کوٹھری میں اپنی روح کے ساتھ مزے سے بیٹھا ہوا ہوں۔ خواب دیکھتا ہوں کہ ایک ختم نہ ہونے والے راستے پر چل رہا ہوں۔ موت کی نیرنگیوں کے درمیان چلا جا رہا ہوں۔ بہشت کی لپٹ آتی ہے، بہشت کی لپٹ مجھے پکارتی ہے۔ میں گرتا پڑتا آگے بڑھتا ہوں اور اپنی بیداری کو برقرار رکھتا ہوں، عظیم، حسین بیداری جس میں نجات کا آہنگ ہے، جو اس شہر، اس جہان میں میرے جسم، میری روح، میرے عمل کے تمام ممکنات سے ارفع ہے۔ اور آج رات اس تنگ زنداں میں، اپنے گوشت پوست میں، خواب میں، یہ بات مجھ کو ڈراتی نہیں کہ کل مجھ کو میدانِ شہر میں پھانسی دے دی جائے گی۔ یہ تصور تک مجھے نہیں ڈراتا کہ مجھ کو الٹی پھانسی سے بھی بدتر اذیتیں

دی جا رہی ہیں۔

لیکن اس سب سے ہزار گنا بدسرنوشت میرا انتظار کر رہی ہے۔

پھانسی کی صبح۔

گھڑیال کی آواز سے میری آنکھ کھلتی ہے۔ کچھ دیر نیند اور بیداری کے درمیان جھولتا رہتا ہوں۔ کہاں ہوں؟

میں دیکھتا ہوں کہ مجھے گھر لے آیا گیا ہے۔ میں اپنے مکان میں، اپنی خوابگاہ میں ہوں۔ حیران و پریشان واش بیسن کے پاس آتا ہوں۔ آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں۔ منہ پر پانی ڈالتا ہوں۔ برش سے چہرے پر صابن ملتا ہوں۔ سیفٹی ریزر میں نیا بلیڈ لگاتا ہوں۔ خون کے تھالوں کے درمیان چمکتی ہوئی اپنی پتلیوں کو گھور گھور کر دیکھتا ہوں۔

کچن سے چائے کی بھینی مہک آتی ہے۔ میری بیوی کے گنگنانے کی آواز آتی ہے۔ پھانسی، موت کچھ نہیں۔

زندہ رہنا ہے۔

❋❋

(فارسی عنوان: ''خواب'')

اسماعیل فصیح

ولادت

بچے کا سر باہر آیا اور تسلے میں تھوڑا خون گرا۔ میری دادی نے زچہ کے دونوں ہاتھ کس کر پکڑ لیے اور کہا:

''زور لگاؤ، کہو یا علیؑ، یا فاطمہ زہراؑ۔''

زچہ اب بھی چیخ چیخ کر روئے جا رہی تھی۔ میری طرف کسی کا دھیان نہ تھا۔ میں بارش میں بھیگتا ہوا آیا تھا اور دروازہ بھیڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ مجھ کو دور سے بچے کے سر کے چپچپے بال دکھائی دیے، پھر اس کی گردن اور نچلا بدن نظر آیا۔ خون پھر گرا۔ میں نے دیکھا بچہ دھیرے دھیرے دنیا میں آ رہا ہے۔

''یا علی ی ی ی۔''

اس کے بعد، کوئی ایک گھنٹے بعد، سب کام پورا ہو چکا تھا۔

باہر موسلا دھار بارش اور طوفانی رات تھی۔ میں جا کر نہر سے دادی کے لیے لوٹے میں پانی لے آیا اور دادی احاطے سے متصل چبوترے پر ہاتھ دھونے بیٹھ گئیں۔ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی بجلی کوند جاتی اور گرج سنائی دیتی۔ احاطہ چمڑے کے کارخانے کے پیچھے کا ایک کھنڈر تھا، جس کے کونے میں دو کمرے بنے ہوے تھے۔ انھیں میں سے ایک کمرے میں ایک عورت کے یہاں زچگی ہوئی تھی۔ آدھی رات کے وقت ایک ہمسائی نے میری دادی خانم جان کو بلوایا تھا۔ خانم جان مجھے بھی اپنے ساتھ لیتی آئیں۔ وہ ساٹھ سال کی ہو گئی تھیں۔ میں چھ سال کا تھا۔

خانم جان نے ہاتھ دھو کر پونچھے۔ آ کر پھٹا پرانا لحاف زچہ پر ڈال دیا۔ زچہ نے آنکھیں کھول دیں۔ خانم جان بولیں:

''اللہ نے تمھیں سنہرے بالوں والا بچہ دیا ہے۔''

''کیا؟'' زچہ بولی، اس پر نقاہت طاری تھی، ''کیا کہہ رہی ہیں؟''

خانم جان بولیں:

''کہہ رہی ہوں تم نے سنہرے بالوں والا بچہ جنا ہے۔ پھر شبِ جمعہ دنیا میں آیا ہے، اس کے وزن برابر چھوہارے خیرات کر دینا۔''

عورت نے پوچھا:

''زندہ بھی ہے؟''

''آئیں! زندہ ہے کیا مطلب؟'' خانم جان بولیں، ''رونے کی آواز نہیں سن رہی ہو؟''

کمرے کے گوشے میں ہمسائی نے آہ بھر لی اور بولی:

''بہ حق پنجتن۔''

وہ بچے کے قنداق [1] میں لگی ہوئی تھی۔ خانم جان نے کہا:

''زندہ ہے۔ اچھا پیارا سا ہے۔''

زچہ بولی:

''آپ کو جنابِ عباس کی قسم۔''

''توبہ ہے،'' خانم جان نے کہا، ''کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اچھا بھلا ہے۔ میں نے کہا خانم آقا لٹھے کے پارچے کو بیچ میں چاک دے کر بچے کی قیامتی کفنی [2] بنا لیں۔''

''تو جیتا رہے گا؟''

''ہاں بھئی ہاں۔ یہ کیا بک رہی ہو؟''

''میرے بچے جیتے نہیں،'' عورت بولی، ''... سب جاتے رہے۔''

دروازے کے پیچھے ہوا چیخ رہی تھی۔ بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ میں چھت کے ایک کونے کو گھور رہا تھا۔ وہاں پانی رسنے لگا تھا۔

---

[1] قنداق: کپڑے کا وہ تھیلا جس میں نوزائیدہ بچے کو گردن تک بند کر دیتے ہیں۔ (مترجم)

[2] ''پیراہن قیامت'' یا ''پیراہن رستاخیز'': بچے کا پہلا لباس جو اس کی سلامتی کے لیے پہنایا جاتا ہے۔ (مترجم)

خانم جان نے بھنویں اچکا کر ہمسائی کی طرف دیکھا۔ ہمسائی بولی:

''کیا جانے، خانم۔ سچ تو کہتی ہے۔''

خانم جان نے زچہ سے کہا:

''یہ تو زندہ سلامت ہے۔ یا ام البنین، سب کی مرادیں پوری ہوں۔''

زچہ نے پوچھا:

''بچہ کہاں ہے؟''

''خانم آقا اسے قنداق میں کر رہی ہیں،'' خانم جان نے بتایا، ''کل قنداق میں مٹھی بھر چاول باندھ کر دو تین دن یوں ہی رہنے دینا، پھر دروازے پر فقیر کو دے دینا۔''

زچہ نے آنکھیں بند کرلیں اور دیر تک نیند میں، یا غش میں، رہی۔ بارش کے دڑیڑوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

ہمسائی خانم آقا، آشیخ حسن قلیونی کی بیوی، نے بتایا کہ زچہ کا نام موچول ہے۔ موچول کا شوہر روح اللہ خاں کیل گھر میں کام کرتا تھا۔ بھلا آدمی تھا۔ یہ لوگ نئے نئے یہاں آئے تھے۔ اس سے پہلے قوام الدولہ کی بزریا میں رہتے تھے۔ موچول حاجی آقا جواد واعظ کے گھر کی ایک بروجردی نوکرانی کی لڑکی تھی۔ روح اللہ خاں آج ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ ہمسائی نے بتایا کہ روح اللہ تھوڑا شرابی ہے مگر ماشاء اللہ ہٹا کٹا مرد بچہ ہے۔ اس کی پہلی بیوی شادی کے پہلے ہی سال زچگی میں مرگئی تھی۔ موچول اس کی دوسری بیوی تھی۔

خانم جان نے زچہ سے کہا:

''گھبراؤ نہیں، بیٹی۔ یہ بچہ تمھارا جیتا رہے گا۔ خوب تندرست بھی ہے۔''

زچہ نے رونا شروع کر دیا۔ پھر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر بولی:

''یا جنابِ عباس، آپ کے حوالے...''

خانم جان بولیں:

''سو جا بچی، آرام کر لے۔''

''آپ کو کیا پتا،'' وہ بولی، ''کیسی نصیبے کی مار ہے کہ چھ چھ بچے جاتے رہیں۔''

''چھے چھے؟''

''چھے سال میں چھے۔ سب جاتے رہے۔''

خانم جان بولیں:

''اللہ کی پناہ!''

آشیخ حسن قلیونی نے اپنے حجرے سے اذان دینا شروع کی۔ زچہ بولی:

''فقط آخر والا علی سات مہینے جیا۔ اس کا نام میں نے 'علی بمان' رکھا تھا۔ مگر . . . ''

خانم جان نے کہا:

''بچہ مرتا ہے تو سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ ماں کے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔''

عورت کہنے لگی:

''باقی کوئی تین دن، چار دن سے زیادہ نہیں جیا۔ اتنے اتنے سے پیدا ہوتے تھے۔ سارے ڈیل سے گہنائے ہوئے۔ تمام میں چھالے اور دَدوڑے۔ سر اور چھاتی پر بھی چھالے ہی چھالے۔ ایک تو نکلا ہی مرا ہوا۔ کیا کیا جھیلا ہے! قوام الدولہ کی بزریا میں صغرا خانم دائی تھی، اس نے سنبھال لیا، نہیں میں بھی گئی تھی۔ علی، وہی جو سات مہینے جیا، آپ نے دیکھا نہیں، چاند سا بچہ تھا۔ پیاری پیاری آنکھیں، گل گوتھنا، ذرا سی ناک، اتنا سا دہانہ۔ وہ بھی جب ہوا ہے تو بدن پر چکتے اور سفید داغ تھے۔ پسلی الگ چلتی تھی۔ ساتویں مہینے پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ تین رات بخار میں بھنتا رہا۔ پھر وہ بھی گذر گیا۔''

''اللہ پر بھروسا رکھ، بیٹی''، خانم جان نے کہا۔

''داغ ہی داغ''، عورت بولی، ''پھوٹی قسمت، نصیبوں جلی۔ چھے چھے بچے جاتے رہیں اور آدمی کچھ نہ کر پائے۔''

''منت مانو''، خانم جان نے کہا، ''آخر پنجتن اور امام بھی تو ہیں۔''

عورت کہنے لگی:

''جب بھی بچہ جنتی تھی، اس کا باپ قنداق کو اٹھا کر جھنجھوڑنے لگتا، بڑے تیہے سے پوچھتا، یہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ اتنا سا کیسے ہے؟ یہ لعنتی داغ دھبے کاہے کے ہیں؟ . . . پھر بچے مرتے تو

میرا جینا دو بھر کر دیتا تھا۔ تاؤ دکھاتا تھا، مارتا کوٹتا تھا۔ یا ابوالفضل العباس، یہ ایک میرا جیتا رہے، یہ ایک نہ مرنے پائے۔''

''اتنی بے چین نہ ہو بچی،'' خانم جان بولیں۔

زچہ دبلی پتلی مختصر سی عورت تھی۔ چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی، ناک پتلی اور نوک پر سے اٹھی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں، الجھے ہوئے سیاہ گھنے بال۔ عمر کا کچھ پتا نہ چلتا تھا: شاید بیس سال۔ چالیس کی بھی ہوسکتی تھی۔

ہمسائی اپنا کام پورا کرچکی تھی اور اب ماں اور بچے کے درمیان جاجم کے ایک کونے پر اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔

زچہ نے خانم جان کو بتایا:

''علی جب چار مہینے کا تھا تو ایک رات میں اس کو درگاہ شاہ عبدالعظیم میں لے گئی، اس کو ضریح سے باندھ دیا اور خوب روئی، اتنا روئی کہ آنکھوں سے خون بہنے لگا۔''

خانم جان بولیں:

''خیر، اب تو یہ گلدستہ سا بچہ مل گیا ہے، اس کے لیے دعا کرو...''

''ہاں، لیکن یہ جیتا بھی رہے گا؟'' زچہ نے پوچھا، ''اس کو بھی تو موت نہیں لے جائے گی؟ جیسے اوروں کو...''

''ہاں بھئی، جیتا رہے گا۔''

''زندگی،'' ہمسائی نے آہ بھری، ''مصیبت، بدنصیبی، دکھوں کا گھر۔ مرنے والے چین سے ہیں۔ خاک یہ دو دن کی زندگی...''

زچہ نے جھجکتے جھجکتے پوچھا:

''یہ بھی اتنا سا ہے نا؟ ستوانسا...''

خانم جان نے کہا:

''نہیں... ستوانسے بچے تو بڑے تیز، ہونہار ہوتے ہیں۔ بڑھتے بھی جلدی ہیں۔''

زچہ اور زور زور سے رونے لگی۔ آنسوؤں سے میری آنکھیں سلگنے لگیں۔ میں نہیں چاہتا تھا

کہ وہ عورت روئے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بچہ مرجائے، مگر مجھ کو یقین تھا کہ بچہ مرجائے گا اور کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔

ہمسائی نے ایک اور زوردار آہ بھری۔

''بچہ کہاں ہے؟'' زچہ نے پوچھا، ''میں بھی تو دیکھوں۔''

''صبر کرو، بیٹی''، خانم جان بولیں، ''قنداق تو ہو جانے دو۔''

خانم جان نے ہمسائی کی طرف دیکھا اور پھر کچھ نہیں کہا۔

''اس کی حالت . . . '' زچہ بولی، '' وہ ٹھیک ٹھاک تو ہے نا؟''

وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھتے ڈر رہی تھی۔ خانم جان نے کہا:

''ٹھیک ہے، بیٹی۔''

ہمسائی نے پلٹ کر خانم جان کو دیکھا۔ زچہ کو بچہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے لالٹین کی روشنی میں بچے کا چہرہ دیکھا۔ ننھا منا، پیارا سا گورا گورا بچہ تھا لیکن اس کی بائیں کنپٹی پر اور ہونٹ پر نیلے داغ یا بڑے بڑے گھاؤ تھے۔ ہونٹ سے اوپر اور آدھے منہ پر ایک بڑا سا لال چکتا بھی تھا۔ اس کی سانس پھنس پھنس کر آرہی تھی۔

زچہ نے ہتھیلیوں سے اپنے آنسو پونچھے اور کہنے لگی:

''جب علی مرا ہے تو جی چاہتا تھا خود بھی زہر کھا کے جان دے دوں۔ دنیا سے، جینے سے جی اٹھ گیا تھا۔ باپ اس کا دو دو رات، تین تین رات گھر نہیں آتا تھا۔ میں خود بچے کو گودی میں اٹھا کر ابن بابویہ کے قبرستان لے گئی۔ دفن کو دے دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے قبر کھدی، ننھی سی قبر میں لٹا دیا گیا، مٹی ڈال دی گئی۔ میرے بچے کو کیڑے، سانپ، چیونٹیاں کھا گئیں۔ اللہ! کلیجا خون ہو کر آنکھوں سے نکلا جاتا تھا۔''

خانم جان نے میری طرف دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا مجھے ساتھ لا کر پچھتا رہی ہیں۔ مجھ کو رونا چلا آرہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ خانم جان جھوٹ بول رہی ہیں۔ بچے مر کر جنت میں نہیں جاتے۔ مردہ بچے ماں کے لیے آخرت میں کوئی گھر ور نہیں بناتے۔ مجھ کو یقین ہو گیا تھا کہ میں خود بھی ایک دن مرجاؤں گا اور مجھے بھی زمین میں گاڑ دیا جائے گا۔ میرے بدن کو بھی کیڑے اور

سانپ اور چیونٹیاں کھا جائیں گی اور کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔

خانم جان مڑیں اور بولیں:

''کیسی باتیں کر رہی ہو، بی بی! بس چپ ہو جاؤ۔ زچائیں ایسے کلام نہیں کرتیں۔ بدشگونی ہوتی ہے۔''

''جب علی مرا ہے،'' زچہ بولی، ''میں پھر پیٹ سے تھی۔ یہی والا تھا۔ اسی کی وجہ سے زہر کھانا چاہتی تھی۔ جانتی تھی یہ بھی مر جائے گا۔ ہر رات، ہر رات مرنے کے خواب آتے تھے۔ دیکھتی تھی بچہ مر گیا۔ اف، اللہ! سب بچے مر جاتے ہیں۔ کسی نے عمل کر دیا ہے۔ مجھ پر لعنت پڑ گئی ہے۔ قسمت پھوٹی ہوئی ہے... جب باپ کو پتا چلا علی مر گیا تو دن رات مجھ پر ستم توڑنے لگا۔ ہر وقت پیے رہتا۔ پھر ایک دن رات گئے گھر میں آیا۔ نشے میں چاقو کھینچ کر چلا میری گردن کاٹنے۔ میں بھاگ کر ہمسائی کے گھر جا چھپی۔''

ہمسائی نے ایک اور آہ بھری اور بولی:

''ہم بدنصیبوں کا جینا مرنا برابر ہے۔''

نوزائیدہ بچے نے رونا شروع کیا اور دھیرے سے ہاتھ چلائے۔ خانم جان نے بناوٹی خوشی سے کہا:

''اب تو اُس کے بدلے میں پیارا سا سنہرے بالوں والا پا گئیں؟ آواز سن رہی ہو؟''

زچہ نے سر نہیں گھمایا، جیسے ڈر رہی ہو۔ بولی:

''بچہ مجھے دکھائیں گی نہیں؟''

''چھے دن رات بچے کو زمین پر لٹانا چاہیے،'' خانم جان بولیں، ''تم نے یہ حدیث نہیں سنی؟ ایک دن رات تو بچے کو ہلانا بھی نہیں چاہیے۔ ساتویں رات خود زچہ بچے کو اٹھا کر پالنے میں لٹائے۔ یہ برکت کی رات ہوتی ہے، اس میں چاہیے کہ مولا مشکل کشا کے نام کی مٹھائی اور میوے فقیروں میں بانٹے۔''

زچہ روئے جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے بچے مر کیوں جاتے ہیں۔ کمرے کی فضا عجب منحوس سی ہو گئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ بچہ مرا ہی چاہتا ہے۔ میری نظر

میں ولادت ایک بری اور نامناسب اور بیہودہ چیز ہو کر رہ گئی تھی، اور موت یقینی... اور مکروہ۔

❀

کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک آدمی اندر آ گیا۔ بارش اور ہوا کے شور میں کسی کو احاطے کا پھاٹک کھلنے کی آواز یا اس کے پیروں کی چاپ سنائی نہیں دی۔ میں تو دروازے کے قریب ہی بیٹھا تھا، مجھ کو بھی اس کی آہٹ نہیں ملی۔ وہ لمبا چوڑا، سیاہ پوش آدمی تھا۔ دروازے کی چوکھٹ پر وہ رکا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں ہوا کے جھونکے اور پانی کی بوچھار آئی۔ اس نے کمرے کی حالت دیکھی اور اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

وہ چھبیس ستائیس سال کا بدشکل آدمی تھا۔ گھنی مونچھیں تھیں اور پھیلی ہوئی ڈاڑھی، بدن پر سیاہ رنگ کا ملا دلا کوٹ پتلون، بدرنگ کالی مخملی کلاہ، کوٹ کے نیچے میلی چکٹ بنیائن، سر سے پیر تک بھیگا ہوا۔ اس کی کلاہ کے کناروں سے پانی ٹپک رہا تھا، منہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے تھے۔ وہ پتلون کو آگے سے کھجائے جا رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ کمرے کو متجسس نظروں سے دیکھتا رہا، پھر پوچھنے لگا:

''کیا ہوا، خانم آقا؟'' اور اس نے کوٹ کے نچلے استر سے اپنا چہرہ پونچھا۔

''مٹھائی کھلواؤ، روح اللہ خاں،'' ہمسائی بولی، ''بیٹا ہوا ہے۔''

اس نے ہمسائی کو مشکوک نظروں سے دیکھا، پھر دو تین بار کھنکھار کر گلا صاف کیا، پھر بولا:

''ہو گیا؟ کب ہوا؟'' اس کی آواز پھنسی پھنسی اور عجیب سی تھی۔

ہمسائی نے اپنی چادر پھر سے کھول کر سر پر ڈال لی اور بولی:

''ابھی، ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ میں نے آشیخ حسن کو بھیجا تھا کہ مدد کے لیے عالیہ خانم کو بلا لائیں۔''

''ہاں میں چلی آئی،'' خانم جان بولیں، ''بچہ جنوا دیا۔ ٹھیک ٹھاک ہے، ماشاءاللہ۔''

اس نے پھسلتی ہوئی نظر زچہ پر ڈالی، پھر دیر تک بچے کی طرف دیکھتا رہا، جوتے اتارے اور کمرے کے اندر چلا آیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے بستر کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ سے

اپنی بیوی کی جانب اشارہ کیا اور ہمسائی سے پوچھا:

''یہ کیسی ہے؟''

نقاہت کی وجہ سے زچہ کا سر نیچے کو ڈھلکا ہوا تھا۔ ہمسائی کے بجائے خانم جان نے جواب دیا:

''کمزوری بہت ہے، لیکن سب ٹھیک ہو جائے گا، بہ حق مرتضیٰ علیؑ۔''

آدمی نے کوٹ اتار کر کمرے کے ایک گوشے میں پھینکا اور کئی بار کھنکھار کر دوسرے گوشے میں چولھے کے پاس تھوکنے لگا۔ زچگی کے اس درد ناک زنانہ منظر اور موت کی ان گفتگوؤں کے بعد ایسی ہیئت کے مرد کا آدھمکنا ایک بے رحمانہ منظر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بچے کے قریب جا کر جھکا، پھر اس نے زمین پر گھٹنے ٹیکے۔ وہ پتلون کو آگے سے کھجا رہا تھا۔

ہمسائی نے پھر سے سر پر چادر درست کی اور کہا:

''ہاں، تو روح اللہ، کیا کھلا رہے ہو؟''

''جو کہیے، بہن،'' وہ بولا۔

''ماں بہت کمزور ہو گئی ہے،'' خانم جان اس کے قریب آ کر بولیں، ''اسے آرام کی ضرورت ہے۔'' وہ ذرا رکیں، پھر بولیں، ''کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے کہ وہ ڈر جائے۔ تکان بالکل نہ ہونا چاہیے۔ بچہ بھی الحمدللہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ ماشاء اللہ بڑا پیارا بچہ ہے۔''

شوہر نے ایک نظر خانم جان کو دیکھا، پھر زیر لب کہا:

''بڑی تکلیف کی آپ نے، خیر، دیکھیے۔''

اس کی پھنسی پھنسی بیماری سی آواز سے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے گلے اور سینے کے اندر خراشیں ہی خراشیں ہیں۔

''بس خدا کا شکر ہے،'' خانم جان بولیں، ''سب کچھ خیر خیریت سے ہو گیا۔ ہم اب چلتے ہیں۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئیں، سر پر رومال لپیٹا، پھر اپنی چادر زچہ پر ڈال دی اور چپکے چپکے اسے کچھ ہدایتیں دینے لگیں۔

آدمی اب بچے کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ گھبراہٹ اور خشونت کی سی کیفیت تھی۔ وہ آگے سے پتلون کو، اپنے پیٹ کو اور جانگھ کو لگا تار کھجا رہا تھا۔

''لا الہ الا اللہ،'' اس نے زیرلب کہا۔

''اٹھو، تم بھی کپڑے بدل کر آرام کرو،'' خانم جان نے اس سے کہا، ''ماں کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔''

''لا الہ الا اللہ،'' مرد بولا، ''یہ والا بھی...''

اس نے اپنی بات پوری نہیں کی۔ وہ اپنی مونچھ کا کونا اور ہونٹ چبا رہا تھا۔ اسے بھی پتا تھا کہ بچہ مرجائے گا، مگر یہ شاید وہ بھی نہ جانتا تھا، نہ اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ کیوں۔

❁

ہم پانی برستے میں گھر کو لوٹے۔ خانم جان بار بار ''استغفر اللہ'' کہہ رہی تھیں۔ تنگ اندھیری گلیوں میں بارش کی وجہ سے کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔

میں نے سر اٹھایا اور پوچھا:

''خانم جان، اس کے بچے مر کیوں جاتے ہیں؟''

بارش کے چھینٹے میرے منھ پر پڑ رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں بارش ہی سے باتیں کر رہا ہوں۔

خانم جان بولیں:

''مجھے کیا پتا، یہ بچوں کے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔''

میں جان گیا تھا کہ یہ کوئی ایسی بات ہے جو میری سمجھ میں آنا چاہیے مگر نہیں آرہی ہے۔ اور اب میرا دل اسے سمجھنا چاہتا بھی نہیں تھا۔

خانم جان بولیں:

''جینا مرنا خدا کے ہاتھ میں ہے۔''

پانی ہمارے چہروں پر بے دردی سے طمانچے مار رہا تھا۔ ہمارے پاس چھتری وتری کچھ

نہیں تھی۔ میں نے خانم جان کی رِدا کا گوشہ تھام رکھا تھا۔

''خانم جان،'' میں نے پوچھا،'' وہ آدمی کھجائے کیوں جا رہا تھا؟''

''میں کیا جانوں،'' خانم جان نے کہا،'' ہوگی کوئی بیماری۔''

میں نے پوچھا:

''یہ بچہ بھی اس کا مر جائے گا؟ ہے نا؟''

''اللہ مالک ہے۔''

''میں نے خود دیکھا تھا،'' میں بولا،'' اس کے منھ پر یہ بڑے بڑے دھبے تھے۔ اس کے ابا کو بھی پتا ہے۔''

''شاید... '' خانم جان نے کہا،'' اللہ چاہے تو بچ جائے گا۔''

لیکن مجھے پتا تھا کہ بچہ مر جائے گا اور کوئی کچھ نہ کر سکے گا۔

❄

اس رات مجھ کو نیند نہیں آئی، مرنے کا خیال آتا رہا، پیدا ہونے کا اور مرنے کا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ پھر اس عورت کے یہاں بچہ ہوگا، اور اب کے اس کی زندگی اور بھی کم، اور بھی تلخ ہوگی۔ تسلے میں بچے کا ہونا، عورت کا رونا، وہ بچے جو مر گئے، خانم جان کی تسلی کی باتیں... موت کے ساتھ... بارش میں مجھے نیند آ گئی۔

❄❄

(فارسی عنوان: ''تولد'')

بابا مقدم

بارش اور آنسو

سرما کی شام تھی۔ بندرگاہِ پہلوی کے کہر آلود اور اداس ساحل پر میں اور محمود چہل قدمی کر رہے تھے۔ ساحل پر میں تھا اور وہ، اور موجوں کا شور اور پرندوں کی آوازیں جو دور سمندر کی سطح سے ملے ملے، پر مارتے چلے جا رہے تھے۔ آگے بڑھ کر سمندر تاریک ہو گیا تھا اور کالے بادل اس پر اس طرح جھک آئے تھے کہ خیال ہوتا تھا وہاں آسمان اور سمندر مل کر ایک ہو گئے ہیں۔

اس نواح کی سردیوں میں ساحل کی فضا رُندھی اور غم آلودسی ہو جاتی ہے۔ دور دور تک پھیلے ہوئے بانس کے بنگلے اور لکڑی کے رنگ برنگے کیبن مکینوں سے خالی ہو کر خوابیدہ ہیولوں کی طرح پڑے نظر آتے ہیں اور گلے ہوئے لٹھے، خالی ڈبے، گذشتہ گرمیوں میں سمندر پر آنے والوں کے عارضی قیام کی بے رنگ نشانیاں، اور بوتلیں جنھیں موجیں ساحل پر پھینک دیتی ہیں اور گھونگھے اور سیپیاں ریت پر بکھری ہوتی ہیں۔ وہاں پر آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ فراموشی اور خاموشی کی ان گھڑیوں میں وہ خود بھی حل ہوا جا رہا ہے۔ ایک اندوہ ناک سکون اس کے وجود میں سرایت کرنے لگتا ہے اور مایوسی اور رائگانی کی کیفیت نیم گرم بھپارے کی طرح اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

ایک بہت بڑی موج سفید چادر کی طرح ہمارے پیروں کے آگے بچھ گئی۔ کچھ دیر تک زمین پر سفید سفید جھاگ ٹکا رہا، پھر وہیں کا وہیں جذب ہو گیا۔ ہمارے پیروں تلے بالو دب کر سخت ہوتی گئی اور اس میں سمندر کا پانی اکٹھا ہونے لگا۔ ہمارے پیر اسے دھنسا کر اس میں سے تھوڑا تھوڑا پانی اوپر کھینچ لیتے تھے۔ ہم پلٹے، مڑ کر دیکھا تو موجوں نے ہمارے قدموں سے پڑنے والے نشانوں کو بھر دیا تھا۔ گویا ہم وہاں تھے ہی نہیں۔ گویا کبھی کسی نے وہاں قدم ہی نہیں رکھا

تھا۔ محمود نے یہ دیکھا تو کہنے لگا:

''عجیب دنیا ہے۔ چند سال پہلے تک میں اسی شہر میں توپ خانے کا افسر تھا۔ جنگ چھڑی تو سب کچھ الٹ پلٹ ہوگیا۔ میں روسی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہوکر اسی شہر میں سلاخوں کے پیچھے پہنچ گیا۔ روسیوں نے توپوں پر قبضہ کرلیا اور افسروں کو جیل میں ڈال دیا۔ سپاہی بھی اِدھر اُدھر ہوگئے۔ بس گھوڑے باقی رہ گئے۔ میرا گھوڑا اَبلق تھا، بڑا خوش رنگ، جوان اور چلبلا، خوب گردن باندھ کر چلتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی رنگت بھی انوکھی تھی، نیلی نیلی سی معلوم ہوتی تھیں۔ بیرکوں میں اس کا نام 'کاسی' پڑگیا تھا۔ 'کاسی' میری سواری کا گھوڑا تھا۔ جوانی اور مستی کے دن تھے۔ کاسی پر سوار ہوتا تو مزہ آجاتا۔ افسر کا گھوڑا تھا، اس لیے اس کی خیال داری اور مان گون بھی دوسرے گھوڑوں سے زیادہ ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ چاق رہتا تھا۔ میں جیسے ہی اس پر سوار ہوتا، وہ ٹانگیں کھول کر چمکتا اور گردن اٹھا کر اگلی ٹاپوں پر ڈلکی چلنے لگتا تھا۔ راستے کی پتھریلی زمین پر اس کے نعل پڑنے کی آواز سے فضا گونجنے لگتی اور داہنے بائیں لوگ کاسی کی مستانہ چال دیکھنے کے لیے چلتے چلتے رک جاتے تھے۔ میں اس پر سینہ تانے بیٹھا ہوتا اور خود بھی گردن اکڑا لیتا اور ترنگ میں آکر جھومنے لگتا۔

میں اور کاسی شہر بھر میں مشہور تھے۔ کاسی مجھ سے اتنا ہلا ہوا تھا کہ اگر میں دور سے اس کو پکارتا تو وہ فوراً گردن گھماتا اور جواب میں ہنہنا کر مجھے دیکھنے لگتا۔ جب میں جیل میں بند ہوا تو سب سے زیادہ فکر مجھے کاسی ہی کی تھی کہ معلوم نہیں اس کے دانے گھاس کی خبر گیری اور ملائی دلائی ہورہی ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ اس کا کیا حشر کیا جائے گا۔ اور بھی ہزار فکریں تھیں۔ خود میرا کیا ہوگا؟ ہمیں یہیں قید رکھا جائے گا یا سائبیریا یا کسی اور علاقے میں پھینکا جائے گا؟ جنگی قیدیوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں سننے میں آرہی تھیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ مجھ کو کہا گیا کہ میں نے تو لڑائی میں توپیں استعمال کی تھیں اور اپنا سارا گولہ بارود دشمنوں پر جھونک دیا تھا، اس لیے میرا انجام بہت برا ہونا ہے۔ لیکن کسی کو ٹھیک ٹھیک کچھ بھی پتا نہیں تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہمارا معاملہ کس کروٹ بیٹھے گا۔ جیل میں ہمارے پاس کرنے کو کچھ نہ تھا۔ میں ایک کونے میں جا بیٹھتا اور سوچا کرتا۔ دل چاہتا تھا آزاد ہوجاؤں اور جاکر کاسی کو دیکھوں، اس کی گردن تھپتھپاؤں،

اس کی تھوتھنی پر ہتھیلی رکھ کر اس کی سانس کی گرمی محسوس کروں۔ یہ سارے خیالات دن ہی دن رہتے، مگر راتیں!

راتیں وحشت ناک ہوتی تھیں۔ قیدیوں کے سونے کی اپنی اپنی ادائیں تھیں۔ کچھ تھے جو زور زور سے خراٹے لیتے تھے۔ بعض پوری آواز سے بولے جاتے، حکم احکام دیتے اور کبھی رونا شروع کر دیتے۔ ان کی فریادیں اور بولیاں سن کر طبیعت میں عجیب مایوسی اور افسردگی پیدا ہو جاتی۔ وہاں آدمی دیکھتا کہ لوگ کیا کیا ارمان لے کر سونے لیٹتے ہیں اور خوابوں کی دنیا میں پہنچ کر کابوسوں سے دوچار ہو جاتے ہیں، چلّاتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں، گھگھیاتے ہیں۔ کبھی کسی بات کا اعتراف کر جاتے ہیں، کبھی کسی تمنا کا اظہار، اور کبھی بہکنے لگتے ہیں۔ میرے خوابوں کی دنیا کے زیادہ حصے پر کاسی کا عمل تھا۔ مجھے اس کی نیلگوں آنکھیں نظر آتیں کہ اندھیرے میں چمکتی ہوئی میری طرف ٹکٹکی باندھے ہیں۔ ان نگاہوں میں التجا ہوتی اور ملامت بھی ہوتی۔

ایک دن جیل میں خبر پھیل گئی کہ کل روس والے توپیں اور گھوڑے جہازوں میں بھر کر لیے جا رہے ہیں۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کاسی کا کیا ہوا؟ اسے بھی لیے جا رہے ہیں؟ اگر یہی ہوا...؟ میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ یہ آس بھی ٹوٹ جائے گی کہ کبھی کاسی کو پھر دیکھ سکوں گا۔ وہ میرا دوست تھا۔ ہم دونوں ہی جنگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے، اور اب اس کو لیے جا رہے تھے۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو کاش میں بھی اس کے ساتھ چلا جاتا۔ میں نے اپنے ساتھی قیدیوں کے سامنے توپوں اور گھوڑوں کا ذکر چھیڑا اور کاسی کے بارے میں ان کا خیال دریافت کیا۔ سب قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ آخر ایک قیدی نے کہا کہ کاسی سواری کا گھوڑا ہے۔ توپ گاڑی کھینچنے کے کام کا نہیں، پھر لڑائی کا زمانہ ہے، رسد کی یوں ہی کمی ہے۔ اس لیے یقینی بات ہے کہ کاسی کو کاٹ کر اس کا گوشت کھا لیا جائے گا۔

تو کاسی کو ذبح کر ڈالا جائے گا اور اس کا گوشت فوجیوں کو کھلا دیا جائے گا... پھر وہ فوجی بھی محاذوں پر مارے جائیں گے، بیچارے!

اسیر ہونا اور جیل میں پڑنا بری چیز ہے۔ قید میں آدمی کا مزاج عجیب سا ہو جاتا ہے۔ خود پر اس کا بس نہیں ہوتا اور وہ ایک فاضل شے بن کر رہ جاتا ہے۔ ہر دن، ہر ساعت اس کے دماغ

میں ہزار خیالوں کے بلبلے ابھرتے ہیں اور ایک ایک کر کے پھوٹ جاتے ہیں۔ رات آتی ہے تو خوابوں کی کہریلی دنیا کے آسیب اس پر یلغار کرتے ہیں۔ دوسرے دن پھر وہی فکریں، وہی خیال، وہی ہراس، وہی ناامیدی، وہی جیل کے بدذائقہ پتلے شوربے کے ساتھ سخت پتھر روٹیاں نگلنا اور سوچتے رہنا۔

جب یہ خبر اڑی کہ کل گھوڑوں کو لے جائیں گے، مجھے سارے دن کاسی ہی کا خیال آتا رہا۔ رات کو بھی بڑی بے چین نیند سویا۔ دوسری صبح ہم سب قیدی وقت سے پہلے جاگ اٹھے تاکہ جیل کی کھڑکیوں سے توپوں اور گھوڑوں کے لے جانے کا تماشا دیکھیں۔ یہ تماشا دیکھنا بھی ایک تماشا ہی تھا۔ آدمی سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کا مال لوٹے لیے جاتے ہیں، اور کچھ نہیں کر سکتا۔

ہم کھڑکیوں کے پاس جا کھڑے ہوے۔ وہاں سے بارکوں کا احاطہ اور اصطبل دکھائی دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ بارش کی ہلکی دھند میں دور سے گھوڑوں کے سر نظر آئے۔ ایک ایک روسی سپاہی دو دو کوتل گھوڑوں کو دہانوں سے پکڑے کھینچتا لا رہا تھا۔ گھوڑوں کو دیکھ کر مجھ پر عجیب ناامیدی سی چھا گئی۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا، ٹانگوں میں دم نہ رہا اور منھ خشک ہو گیا۔ پھر بھی میں نے گردن آگے بڑھا دی کہ ان گھوڑوں میں کاسی کو تلاش کروں۔ ہماری فوج کے سب گھوڑے گہرے رنگ کے سرنگ اور کمیت تھے۔ صرف کاسی کے رنگ میں سفیدی اور اجلا پن تھا۔ وہ ابلق گھوڑا تھا۔ اس کے بدن بھر پر چھوٹی چھوٹی بھوری اور کتھئی چتیاں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفید رنگ پر ان دو رنگوں کا چھینٹا دے دیا گیا ہے۔

دور پر میں نے اس کا چتکبرا رنگ دیکھا۔ میری سانس گھٹنے لگی۔ وہی تھا۔ اس کے تیوروں کا تیکھا پن اور گردن کا کھنچاؤ رخصت ہو چکا تھا۔ سر لٹکا ہوا اور کنوتیاں گری ہوئی تھیں۔ اگلی چھل بل اور طراروں کا کہیں پتا نہ تھا۔ میلا چکٹ ہو رہا تھا۔ ٹانگوں پر کیچڑ اور لید کے تھکے جم گئے تھے۔ ہفتوں سے نہ ملائی دلائی ہوئی تھی، نہ کھریرا پھیرا گیا تھا۔

وہ جیل کے سامنے پہنچا تو میری زبان کو قفل لگ گیا۔ چاہتا تھا پکاروں، کاسی کو بلاؤں، چوکیداروں سے کہوں کہ اسے ذرا میری طرف گھما دیں۔ میں نے کسی طرح خود کو سنبھالا اور

سو کھے گلے سے دو تین بار صرف ایک لفظ نکال پایا:

''کاسی! کاسی! کاسی!''

ابلق گھوڑے میں جان سی پڑ گئی۔ یقین کرو، اس کی گردن تن گئی۔ اس نے سر گھمایا اور جہاں سے میں نے اسے پکارا تھا اس طرف دیکھنے لگا اور زور زور سے ہنہنایا۔ نہیں معلوم قیدیوں کے جھرمٹ میں کھڑکی کے پیچھے میں اس کو دکھائی دیا کہ نہیں، مگر چند لمحوں کے لیے اس کے پیروں میں وہی رقص کی سی چلت پھرت نظر آئی۔ پھر سپاہی نے اس کے دہانے کی آہنی ڈنڈی کو اس کے منھ کے اندر زور سے کھٹکھٹایا اور تکلیف کی شدت سے اس کی حالت پھر اسی طرح ردّی ہو گئی۔

کاسی کو لے گئے۔ دوسرے گھوڑوں کے ساتھ اسے بھی جہاز پر چڑھا دیا گیا اور ہم دور سے دیکھتے رہے کہ وہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔''

❁

ہم دونوں سنسان پشتے پر چل رہے تھے۔ سمندر کی جانب سے تیز ہوا کے جھونکے آ رہے تھے اور موجیں پشتے سے ٹکرا ٹکرا کر پانی اڑا رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑ رہی تھی۔ میں نے محمود کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے اور رخساروں پر تری تھی۔ میں نے پوچھا:

''کیا روئے ہو؟''

وہ بولا:

''نہیں، ہماری عمروں کے آدمی روتے نہیں، آنسو ہی نہیں نکلتے۔ بارش ہوئی ہے۔''

اندھیرا پھیل رہا تھا۔ سمندر کالا ہوتا جا رہا تھا۔ ہم واپس آنے لگے اور راستے میں محمود کو میں نے یہ قصہ سنایا:

''میں فوج میں نیا نیا افسر ہوا تھا۔ روز صبح صبح میں اپنے گھر کی گلی کے آگے سڑک پر جا کھڑا ہوتا۔ میری رجمنٹ کی بس آتی اور میں اس پر سوار ہو کر کیمپ چلا جاتا تھا۔ ایک دن میں ذرا جلدی سڑک پر آ گیا تھا۔ کچھ بس نے بھی دیر لگائی۔ میرا ایک دوست ادھر آ نکلا اور ہم وہیں کھڑے

کھڑے باتیں کرنے لگے۔ وہ بھی فوج میں افسر تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ اس کے پاس ایک خوبصورت بادامی سمند گھوڑا ہے جسے وہ بیچنا چاہتا ہے۔ میں اس دوست سے بخوبی واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ معاملت کا کھرا آدمی ہے، اور سمند گھوڑے مجھ کو پسند بھی تھے۔ لہٰذا میں نے جانور کو دیکھے بغیر خرید لیا اور سودا وہیں کا وہیں پکا ہوگیا۔ دوست یہ کہہ کر رخصت ہوگیا کہ اسی دن گھوڑے کو میری رجمنٹ میں بھجوا دے گا۔

ہماری رجمنٹ کا پڑاؤ شہر سے فاصلے پر تھا اور دو پہر کو ہم وہیں رہ جاتے تھے۔ اُس دن میں کھانا کھا کر اٹھا ہی تھا کہ ایک سپاہی خبر لایا کہ گھوڑا آ گیا ہے۔ ہمارے کیمپ کے بیچ میں ایک لمبی سڑک تھی جس کے دونوں طرف چنار اور سفیدار کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ ان میں سفیدار چناروں سے اونچے نکل گئے تھے۔ میں دفتر سے باہر آ کر سڑک پر کھڑا ہوگیا۔ دیکھا ایک سپاہی شوخ رنگ کے ایک گھوڑے پر بیٹھا ہوا آ رہا ہے۔ بڑے قد کاٹھ اور بلند گردن کا گھوڑا تھا۔ جسامت ایسی کہ اس کے زین پر بیٹھا ہوا سپاہی چھوٹا سا معلوم ہو رہا تھا۔ قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ عجب خوش انداز اور خوش رنگ گھوڑا ہے۔ اس کے رونگٹے سنہری مائل تھے اور جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ چھوٹا سر، نرم چمکیلی آنکھ، مضبوط جوڑ بند اور بھاری سُم، اونچی گردن، تنا ہوا سینہ، چلنے رکنے میں سر کو باندھے ہوے۔ اس چھب کا گھوڑا آج تک میری نظر سے نہیں گذرا تھا۔ سمند گھوڑا کم ہوتا ہے، خصوصاً یکساں اور شوخ بادامی رنگ کا سمند۔ میں بے اختیار ہو کر اس کی سری اور کنوتیاں سہلانے لگا۔ وہ مزے میں کھڑا رہا، جیسے برسوں کا مجھ سے ہلا ہوا ہو۔ سپاہی اس پر سے اتر پڑا اور میں وہیں آزمائش کے لیے اس کی رکاب میں پیر ڈال کر زین پر بیٹھ گیا۔ گھوڑا آگے بڑھا تو میں نے اسے پویا چلایا۔ پھر دلکی۔ اس کے بعد کیمپ کی سڑک پر دور تک بڑے اطمینان کے ساتھ سرپٹ دوڑایا۔ اس کی سواری ایسی ہموار اور عمدہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا نرم گدے پر بیٹھا ہوں اور فضا میں تیر رہا ہوں۔

ہم نے اس کو اصطبل میں پہنچا دیا اور وہاں سپاہی کو لوٹانے کے لیے اس کا زین اتارا گیا تو ہم یہ دیکھ کر حیران گئے کہ یہ خوبصورت گھوڑا زیں پشت ہے۔ زیں پشت اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کی کمر میں نیچے کی طرف خم ہوتا ہے۔ یہ گھوڑے کا عیب سمجھا جاتا ہے، کہتے ہیں اس خم کے

زیادہ ہونے سے گھوڑے کا دم کم ہو جاتا ہے۔ اس گھوڑے کی کمر میں زیادہ خم تھا۔ اس کی پیٹھ کا وہ حصہ جہاں زین رکھتے ہیں، کمان کی طرح جھکا ہوا تھا۔ لحہ بھر کو مجھے خیال آیا کہ اسے واپس پھیر دوں۔ لیکن میرا جی نہ مانا۔ بہت خوبصورت گھوڑا تھا۔ اس کی اصالت، اس کے تیور اور اس کے جمال سے کیونکر آنکھیں پھیر لیتا۔ گھوڑے کو اصطبل میں باندھ دیا گیا اور دوسرے دن سے وہ میری سواری میں رہنے لگا۔ تمھارے اور اس ابلق گھوڑے کی طرح مجھ میں اور اس سمند میں بھی عجب چاہت اور لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ میرا بلند قامت زیں پشت سمند، جو گردن اٹھا کر چلتا اور بن بن کر زمین پر پاؤں رکھتا، بہت جلدی مشہور ہوگیا۔ سرپٹ چال میں وہ صرصر کی طرح فضا کو چیرتا نکل جاتا اور چونکہ اس کی کمر میں خم تھا، اس لیے اس پر بیٹھنے میں بڑی راحت ملتی تھی۔

ایک ہی دو سال گذرے تھے کہ توپ گاڑیاں پٹرول سے چلنے لگیں۔ پرانی چال کی گاڑیاں کباڑ خانوں میں ڈھیر ہوتی گئیں اور انھیں کھینچنے والے گھوڑے گلّوں میں بھیجے جانے لگے۔ فوج سے اصطبل اور گھوڑوں کا صیغہ ہی ختم ہوگیا تو میں بھی مجبور ہوا کہ اپنے سمند کو وہاں سے ہٹا لے جاؤں، اور چونکہ میرے پاس اسے رکھنے کا ٹھکانہ نہیں تھا، اس لیے اس کو بیچنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ دو تین ہفتے اسی ادھیڑبن میں گذر گئے۔ میرا دل اس کو الگ کرنے پر کسی طرح نہیں اٹھتا تھا۔ مگر بالآخر جب سارے اصطبل گھوڑوں سے خالی ہو گئے اور توپ گاڑیاں ہٹا دی گئیں اور خود میرا تبادلہ بھی اسٹاف میں ہوگیا تب مجھے اپنے گھوڑے کو صبر کرنا ہی پڑا۔ میری رجمنٹ کا ایک سائیس، جو چھٹی میں آ گیا تھا، ایک خریدار کو لے آیا۔ اس نے گھوڑے کو دیکھا بھالا، پسند کر لیا اور پیسے بھی اچھے دیے۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا کہ اس لاڈلے گھوڑے کو تکلیف نہ دے، اور اگر اسے بیچے تو کسی ایسے آدمی کے ہاتھ بیچے جو اس کو فٹن یا چھکڑے میں نہ جوتے۔

کئی مہینے گذر گئے۔ مجھے اپنے زیں پشت سمند کی یاد آتی رہتی تھی اور جیسا کہ تم نے بتایا، میرا بھی دل چاہتا تھا کہ کسی صورت اسے دیکھوں، تھپتھپاؤں اور اس بے زبان کے منھ کے آگے ہاتھ کروں اور اس کی گرم اور نرم سانسوں کو محسوس کروں۔

ایک دن خیابانِ شمیران کی چڑھائی پر مجھ کو ایک اونچا، لاغر، زیں پشت گھوڑا دکھائی دیا۔ آنکھیں بجھی بجھی، نڈھال بدن پسینے میں تربتر، مگر اسی آنچ کے ساتھ جو مجھے اپنے سمند میں نظر آتی

تھی، بوجھ سے لدے ہوے ایک کھڑ کھڑے میں جُتا اسے کھینچ رہا تھا۔ کوچوان نیچے اتر کر اس پر چابکیں برسا رہا تھا اور کھڑ کھڑے کو دھکا لگا کر تیزی سے چڑھائی چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہی تھا۔ اس کا سنہرا بدن میل کچیل اور پسینے کے لیپ سے چکٹ کر کالا ہو رہا تھا۔ میرا بہت جی چاہا کہ اس کو قریب سے جا کر دیکھوں، اسے پکاروں اور اس کا بدن سہلاؤں، لیکن مجھے اس سے شرم سی آ رہی تھی۔ وہ ایسے حال میں نہ تھا کہ میں اس کے سامنے جا سکتا۔ اس کی رگیں ابھر آئی تھیں اور داہنے بائیں پٹھوں پر اور پیٹھ پر چابک کی مار سے نالیاں سی بن گئی تھیں۔ میں نے سوچا کوچوان سے بات کر کے گھوڑے کی کچھ سفارش کروں لیکن اس سے ہونا کیا تھا۔ وہ شکستہ حال قیدی، وہ تھکا ہارا زیں پشت سمند، جواب میرا نہیں تھا، اپنے مقدر کا لکھا پورا کر رہا تھا۔ میں خود سمجھ سکتا تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتا ہو گا۔''

❁

پانی تیز برسنے لگا تھا اور تاریکی پھیل گئی تھی۔ میں اور محمود اپنے کمرے پر پہنچ گئے تھے۔ بلب کی روشنی میں محمود نے مجھے دیکھا اور بولا:

''تمھارا چہرہ بھیگا ہوا ہے۔ روئے ہو؟''

''اس عمر کو پہنچ کر آدمی روتا نہیں...'' میں نے کہا، ''پانی برس رہا ہے۔''

❁❁

(فارسی عنوان: ''باران واشک'')

بابا مقدم

پنجرے

پنجروں کا عجائب خانہ اس شہر کی قابلِ دید جگہوں میں سے تھا۔ وسیع میدان میں ایک پہاڑی پر بنی ہوئی اس کی مخروطی چھت والی عمارت دور ہی سے نظر آنے لگتی تھی۔

موٹریں تماشائیوں کو ایک لہراتی ہوئی سڑک سے، جس کے دونوں طرف شہتوت کے درخت لگے ہوئے تھے، عمارت کے سامنے والے میدان میں اتارتی تھیں۔ اگر کوئی پہاڑی پر پیدل جانا چاہتا تو اس کے لیے ایک تنگ راستہ تھا جس پر سو سے زیادہ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ پیدل جانے والا دو تین بار بیچ بیچ میں بنے ہوئے چبوتروں پر بیٹھ کر ستانے کے بعد بھی آگے بڑھ سکتا تھا۔

اوپر سے نیچے تک پوری پہاڑی تھالوں میں ترتیب کے ساتھ لگائی ہوئی انگور کی بیلوں اور سماق کی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ایسے بنجر میدان میں جہاں خاردار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ اگتا تھا، اس ہری بھری پہاڑی کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا اور ہر شخص کا جی چاہتا تھا کہ ان سیڑھیوں سے اوپر چڑھے اور اس سبز پہاڑی پر سے میدان اور اطراف کے نشیب و فراز کا سماں دیکھے۔

باہر سے عجائب خانے کی شکل ایک چوڑے ستون کی سی تھی جس کی چھت گنبد نما تھی۔ اس کی دیوار بندی زمین سے اٹھ کر گنبد تک پہنچتی ہوئی لوہے کی لمبی لمبی سلاخوں سے کی گئی تھی۔ گنبد کے سرے پر ایک حلقہ تھا اور اس میں لگا ہوا ایک بڑا سا آنکڑا اوپر فضا میں اٹھا چلا گیا تھا۔

عمارت کا فرش دور دور پر بنے ہوئے پایوں پر قائم کیا گیا تھا اور اس طرح دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑا پنجرہ آسمان سے لٹکا ہوا ہے۔

اگر کوئی پنجروں کے عجائب خانے کی سیر کرنا چاہے تو اس کو عمارت کے سامنے کے میدان سے شروع ہونے والی کچھ اور سیڑھیاں چڑھ کر اس بڑے پنجرے کے دروازے تک جانا ہوگا۔ وہاں پنجرے ہی کی شکل کے ایک حجرے میں عجائب خانے کے تنہا محافظ سے معلوماتی کتابچہ لے کر وہ عمارت کے اندر داخل ہوگا۔

عمارت کے اندر تین منزلیں ہیں اور اس کے مرکز میں بنا ہوا ایک پیچ دار زینہ ان تینوں منزلوں کو آپس میں ملاتا ہے۔

اور یہ عمارت پنجروں سے بھری پڑی ہے۔ چھوٹے اور بڑے پنجرے، لکڑی کے پنجرے، لوہے کے تار کے۔بنے ہوئے پنجرے، سونے کے اور چاندی کے پنجرے۔ اور یہ پنجرے طرح طرح کی شکلوں کے ہیں۔ ان میں سے بعض، جو دوردست سرزمینوں کے نیم وحشی قبیلوں اور پہناور سمندروں کے جزیروں سے حاصل کیے گئے ہیں، ایسی ایسی وضعوں کے ہیں کہ تماشائی انھیں اچھی طرح دیکھنے کے لیے دیر دیر تک ایک ہی جگہ کھڑا رہ جاتا ہے۔ ہر پنجرے کے پاس ہی یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ اسے کہاں بنایا گیا، کب خریدا گیا اور اس میں کس قسم کا جانور یا پرندہ رکھا جاتا تھا۔ ان پنجروں میں کوئی جانور نہیں ہے۔ سب خالی ہیں اور ان میں کھانے پینے کے برتن جوں کے توں رکھے ہوئے ہیں۔ سارے پنجروں میں جانوروں کے بیٹھنے اور سونے کے اڈے، پٹریاں، کڑے اور آشیانے بھی موجود ہیں۔

عجائب خانے کے اندر کی فضا بھی ایسی ہے کہ ذرا غور کرنے پر تماشائی خود کو اچانک ایک بڑے سے پنجرے میں بند محسوس کرتا ہے اور اس پر دہشت طاری ہوجاتی ہے۔

سب سے پہلا پنجرہ، جس کا نمبر ایک ہے، چھوٹا سا اور لکڑی کا بنا ہوا ہے جس میں پانی پینے کی کٹوری اور دانے کا برتن رکھا ہوا ہے۔ معلوماتی کتابچہ دیکھنے پر تماشائی کو اس کی صراحت ملتی ہے۔

❄

میں نے پہلے قفس کو ایک لڑکے کے پاس دیکھا جس نے اس میں ایک گوریا کا بچہ بند کر

رکھا تھا۔ یہ ننھا پرندہ پنجرے کے اندر سکڑا ہوا اونگھ رہا تھا۔

میں نے یہ پنجرہ پرندے سمیت لڑکے سے خرید لیا۔ پرندے کا پوٹا سوج گیا تھا اور وہ بالکل نڈھال ہو رہا تھا۔ میں نے اسے رہا کر دیا۔ وہ جھجکتا ہوا پنجرے سے باہر نکلا اور اپنے کمزور پروں سے بمشکل اڑ کر ایک دیوار پر بیٹھ گیا۔ پھر وہاں سے بھی اڑا اور ایک درخت کی ٹہنی پر جا بیٹھا۔ میں خالی پنجرہ اپنے ساتھ لے آیا اور کئی دن تک اپنے کمرے میں رکھ کر اسے دیکھتا رہا۔

میں دیکھتا تھا کہ بہت سے لوگ طرح طرح کی چیزیں جمع کرتے ہیں اور اپنے اس شغل میں انھیں بڑا انہماک رہتا ہے۔ لوگ ٹکٹ جمع کرتے ہیں، ماچس کی ڈبیاں، قفل، پرانے پیالے اور قابیں اِدھر اُدھر سے تلاش کر کے اکٹھا کرتے ہیں، میں نے بھی ارادہ کر لیا کہ میں پنجرے جمع کروں گا۔ یہ خیال مجھے پسند آیا۔ مجھے اپنے باپ کے ترکے میں بڑی جائیداد ملی تھی۔ میرے بیوی بچے بھی نہیں تھے۔ میرے سے تنہا آدمی کے لیے یہ بڑا اچھا مشغلہ تھا۔ لہٰذا میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بازاروں اور محلوں میں گھومنا شروع کیا اور پنجرہ نمبر دو خریدا۔ اس پنجرے میں ایک طرقہ تھا۔ گوریا سے کچھ بڑا مٹیالے رنگ کا یہ پرندہ پنجرے کے فرش پر مستقل اِدھر سے اُدھر چکر کاٹا کرتا ہے اور ہمیشہ باہر کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔

جس دن میں نے اسے دیکھا، وہ چہچہا رہا تھا اور سیٹیاں بجا رہا تھا۔ وہ اپنے ہم جنسوں کو بلا رہا تھا، بیابانوں کا خواہاں تھا، کھلی فضا کا طالب تھا جس میں پر کھول کر اڑ سکے۔ آزادی کے لیے اس کی یہ کوشش اور فریاد کا انداز دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ جیسے بھی بن سکا، میں نے اس کے مالک کو، جو ایک دکاندار تھا، راضی کر کے اسے خرید لیا اور گھر لے آیا۔ یہ پرندہ دن بھر میرے گھر میں سیٹیاں بجاتا اور زور زور سے چہچہاتا رہا۔ پنجرے کے اندر ایک آئینہ لگا ہوا تھا۔ پرندہ کبھی کبھی اس کے سامنے آ کر ٹھہر جاتا اور یہ سمجھ کر کہ سامنے ایک اور طرقہ ہے، اپنے حلقوم کو پھلا کر چہچہانے لگتا۔ اسی دن سہ پہر کے قریب میں نے اس کا پنجرہ اٹھایا اور شہر کے باہر آ گیا۔ ترکاریوں کے ایک کھیت میں جا کر میں نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور پرندے کو آزاد کر دیا۔ ایک شخص جو وہیں پر موجود تھا، کہتا رہا کہ اس پرندے کو شکرا جھپٹ لے جائے گا مگر میں اس کی بات پر کان دھرے بغیر دیکھ رہا تھا کہ پرندہ اڑا اور اڑتے اڑتے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

گھر لوٹ کر میں بہت خوش تھا کہ اب میرے پاس ایک اور پنجرہ ہو گیا۔ میں نے اسے جھاڑ پونچھ کر ایک کھونٹی سے لٹکا دیا۔ یہ مضبوط پنجرہ تھا جس کے گڑے تانبے کے تھے، غلاف سرخ کپڑے کا، پانی کی کٹوری پھول دار چینی کی، دانے کی پیالی پر منبت کاری، اور ایک چھوٹا سا آئینہ۔

پھر دو تین دن ایسے گذرے کہ میرے دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا میں اس کو دور نہ کر سکا۔ میں نے خود سے کہا:

"اے مرد! ہر شخص کسی نہ کسی راستے پر لگا ہوا ہے۔ یہ تیرا راستہ ہے: پرندوں کو ان کے پنجروں سمیت خریدنا، پرندوں کو آزاد کرنا اور پنجروں کو جمع کرنا۔"

کبھی کبھی میں یہ سوچ کر خوش ہوتا تھا کہ ایک دن میں پنجروں کے سب سے بڑے ذخیرے کا مالک ہو جاؤں گا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک دن ایسا آئے جب دنیا میں کوئی پنجرہ باقی نہ رہ جائے یا کم از کم وہ سرزمین جہاں میں رہتا ہوں پنجروں سے خالی ہو جائے۔

اسی فکر اور اسی آرزو میں آخر میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے دو لڑکوں کو ملازم رکھ کر اپنے ساتھ لیا۔ میں جہاں بھی کسی پرندے کو پنجرے میں دیکھتا اسے خرید لیتا۔ بہت سے لوگ اپنے پنجرے بیچنے پر تیار نہ ہوتے۔ کہتے کہ یہ تو ہمارا مشغلہ ہے اور ہم اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ میں جواب میں نرمی کے ساتھ ان سے بحث کرتا اور بہر طور آخر کار مجھی کو کامیابی ہوتی۔ ان سب کو پیسہ ہر چیز سے عزیز تھا۔

اس دن میں نے گیارہ پنجرے خریدے۔ ان پنجروں میں چار سہرے، دو گوریاں، ایک طرقہ، ایک طوطا، دو قناریاں اور ایک بلبل تھی۔ دونوں ملازم لڑکوں کی مدد سے میں ان پنجروں کو شہر کے باہر ایک باغ میں لے گیا اور ان سب لوگوں کے سامنے جو ہمارے ساتھ ہو لیے تھے، میں نے پرندوں کو چھوڑ دیا۔ کئی لوگوں نے کہا کہ قناریاں بھوکی مر جائیں گی، گوریوں کو شکرا کھا جائے گا، طوطا اس علاقے میں زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن میں ان کی باتوں پر دھیان دیے بغیر پرندوں کو آزاد کر کے خالی پنجرے گھر لے آیا۔

میرے اپنے شہر میں بہت سے لوگ کرک پالتے تھے۔ یہ پرندہ درخت پر نہیں بیٹھتا بلکہ

میدانوں اور کھیتوں میں رہتا ہے۔ اس کی رنگت خاکی اور جسامت کبوتر سے کم ہوتی ہے، جنگلی جھاڑیوں اور گیہوں کے کھیتوں میں انڈے دیتا اور بچے پالتا ہے۔ اس کا شکار کرنے والے جس کھیت میں اس کی آواز سنتے ہیں اس کے قریب ہی جال بچھادیتے ہیں۔ پھر اپنے ساتھ لائے ہوے سامان کی مدد سے ایسی آواز پیدا کرتے ہیں جو اس کی مادہ کی آواز سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ بے چارہ پرندہ آواز کی طرف بڑھتا ہے اور ناگہاں جال میں پھنس جاتا ہے۔ تب اس کو پکڑ کر پنجرے میں بند کرلیتے ہیں۔ یہ اسیر پرندہ دن رات پنجرے کے در و دیوار پر ٹکریں مارتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے سر اور پروں سے خون بہنے لگتا ہے، اور لوگ اس کو تلف ہونے سے بچانے کے لیے پنجرے کی دیواریں سوت کی جالی سے بناتے ہیں۔ گرمی کے دنوں میں سویرے تڑکے جب دھندلکا چھایا ہوتا ہے اور صبح کی نرم ہوا چل رہی ہوتی ہے، کرک بولتا ہے۔ اس کی آواز میں تمنا، یاس اور التجا ہوتی ہے۔ میں نے کرک کا سا آزادی کا جویا کوئی پرندہ نہیں دیکھا۔ یہ کبھی پنجرے سے مانوس نہیں ہوتا، ہمیشہ باہر کی سمت دیکھتا رہتا ہے اور ہمیشہ پنجرے کی جالیوں سے سر ٹکراتا رہتا ہے۔

میں نے فیصلہ کرلیا کہ سب کرکوں کو آزاد کر کے رہوں گا۔ اپنی املاک سے میری یافت بہت تھی اور اس کی بدولت اپنے فیصلے پر عمل کرنا میرے لیے بہت آسان ہوگیا۔ اتنا کہ کچھ عرصے کے اندر اس شہر میں ایک بھی ایسا پنجرہ نظر نہیں آتا تھا جس میں کوئی پرندہ قید ہو۔ اب کسی کو پنجرے کے اندر سے بلبل کی آواز، قناری اور طرقے کی چہچہاہٹ، طوطے کی بولی سنائی نہیں دیتی تھی۔ اب صبح کی ٹھنڈی ہوا میں گھروں کے اندر سے آتی ہوئی کرک کی فریاد کانوں تک نہیں پہنچتی تھی۔ ہم دیکھتے تھے کہ قمریاں چھتوں پر بیٹھی ہوئی ہیں اور طوطے شہر کے باغوں میں اونچے درختوں پر سے ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے ہیں۔

جب میں اپنے گھر میں خالی پنجروں کو دیکھنا شروع کرتا تو مجھ پر ایک کیف و نشاط کا عالم طاری ہوجاتا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ دنیا میں اکیلا میرا ہی شہر نہیں ہے۔ اور جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک میری عمر ختم نہیں ہوتی، میرا کام بھی باقی ہے۔ مجھے دور افتادہ قریوں اور شہروں، زخار سمندروں کے دور دست جزیروں، تپتی ہوئی زمینوں، سر بہ فلک برف آلود پہاڑوں سے

ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پنجرے لانا ہیں۔ ذخیرے کو مکمل ہونا چاہیے، ذخیرے میں ہر نمونہ موجود ہونا چاہیے۔ میرا ذخیرہ تو محض مقامی تھا اور اس کی میری نظروں میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔

تو میں نے سفر کا سامان کیا اور دوسرے ملکوں کی سیاحت کے لیے روانہ ہوا۔ جس طرح شہر بہ شہر لوگوں کی زبان، لہجے، شکل صورت، رسم و رواج میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے اسی طرح الگ الگ شہروں کے پنجروں کی ساخت اور پرندوں کی قسموں میں بھی فرق آجاتا ہے۔ جس چیز میں فرق نہیں آتا وہ انسان کا یہ شوق ہے کہ پنجرے بنائے اور حیوانوں کو اسیر کرے۔ ہر جگہ طرح طرح کی شکلوں والے پنجروں کی کثرت تھی اور ان سب پنجروں میں رنگ رنگ کے پرندے، بھانت بھانت کے جانور نظر آتے تھے کہ یا تو ایک کونے میں سمٹے ہوئے پڑے ہیں یا چیخ رہے ہیں۔

ایک شہر میں مجھے لومڑی کا ایک لاغر اور کمزور بچہ پنجرے میں بند نظر آیا۔ اس کے بال جھڑ رہے تھے اور اس کی سوجی ہوئی سرخ کھال نیچے سے جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے اسے پنجرے سمیت خرید لیا۔ اس کا فروخت کرلینا اس کے مالک کے لیے ایسی امید کے خلاف بات تھی کہ وہ حیران تھا، اور خوش تھا۔ میں نے پنجرہ صحرا میں لے جا کر لومڑی کے بچے کو ٹیلوں کے درمیان چھوڑ دیا۔ اس کا پنجرہ بہت بھاری، غلیظ اور متعفن تھا۔ اس کا ساتھ لانا دشوار اور بیکار تھا، اس لیے میں نے اسے وہیں توڑ کر جلا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ سارے پنجروں کو ساتھ لانا مجھ سے ممکن بھی نہ تھا۔ لہٰذا میں ہر جگہ کے صرف دو ایک خاص پنجرے چھانٹ کر رکھ لیتا اور بقیہ کو ضائع کر دیتا۔ میں ایک مشہور آدمی ہو چکا تھا، وہ آدمی جو پرندوں کو آزاد کرتا ہے، پنجروں کو توڑ ڈالتا ہے یا ساتھ لے جاتا ہے۔ میری خوشی کا یہی واحد ذریعہ تھا کہ جہاں سے میں گذرتا تھا میرے پیچھے کوئی پنجرہ اور اس میں فریاد کرتا ہوا کوئی جانور، کوئی پرندہ باقی نہیں رہتا تھا۔

تماشائی! تو اس عجائب خانے میں پنجرے دیکھ رہا ہے۔ ان کی تعداد ہزاروں سے اوپر ہے۔ میں نے انھیں دور دور کے شہر و دیار سے لا کر جمع کیا ہے۔ اپنے امکان بھر میں ہر جگہ پہنچا اور زیادہ سے زیادہ پنجرے حاصل کرنے کی دھن میں ہر سرزمین کی سیر کی۔ تو اس عجائب گھر میں

ایک پنجرے کے سامنے پہنچے گا جو بہت شاندار اور خوشنما ہے، بہترین لکڑی سے بنایا گیا ہے، ایک چابک دست استاد کی مہارت کا نمونہ ہے۔ اس کو سیپ کے ٹکڑوں، چاندی کی کیلوں اور سونے کے چھلوں سے منقش کیا گیا ہے۔ اس کے حلقوں اور خانوں پر کندہ کاری کی گئی ہے۔ اسے پھول پتیوں اور دلکش وضعوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ایک دن تھا جب اس پنجرے میں ایک مینا بند تھی۔ میں نے اسے یہاں سے بہت دور ایک جگہ دیکھا تھا۔ حسین مینا تھی، سیاہ رنگ، چونچ اور پنجے زرد اور سڈول۔ وہ لگاتار پنجرے میں اِدھر سے اُدھر پھر رہی تھی۔ اڈے پر اس کو چین نہ تھا، بار بار سیٹیاں سی بجاتی اور اس کی تیز آواز دور تک سنائی دیتی تھی۔ میں اسے بڑی منت سماجت کے بعد خرید پایا۔ اس کا مالک اتنے خوبصورت پرندے کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا تھا، مگر آخر راضی ہوگیا۔ میں نے اس کے سامنے ہی پنجرے کا در کھول دیا۔ مینا پر پھڑ پھڑا کر نکلی اور پاس کے ایک درخت پر جا بیٹھی۔ اس کے دوسرے دن وہیں مجھے ایک اور مینا نظر آئی، اتنی ہی بڑی اور اسی وضع قطع کی۔ میں نے اسے بھی خریدا اور آزاد کر دیا۔ تین دن میں تین دفعہ یہی واقعہ پیش آیا۔ چوتھے دن مجھے شبہ ہوا کہ شاید میں اسی ایک پرندے کو چوتھی مرتبہ خرید رہا ہوں۔ اس لیے اب کی بار میں نے پنجرے اور مینا کو ساتھ لیا اور اس شہر سے روانہ ہوگیا۔

راستے میں ایک جنگل کے پاس رک کر میں نے پنجرے کا دروازہ کھولا، مینا آہستہ سے پنجرے کے اڈے پر سے اتری، کچھ دیر تک دروازے پر رکی رہی، اس کی نظر درختوں پر جمی ہوئی تھی، شاخوں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد اچانک مینا نے پر کھول دیے اور جنگل میں غائب ہوگئی۔

غیر ملکوں اور اجنبی سرزمینوں کی سیاحت میں مجھے برسوں لگ گئے۔ بیس سال سے زیادہ عرصے تک میں ملکوں ملکوں شہروں شہروں سرگرداں رہا۔ پنجرے دیکھے، ان میں محبوس جانور اور پرندے دیکھے، پنجرے خرید لیے، جانوروں کو چھوڑ دیا، پرندوں کو اڑا دیا۔ خالی پنجرے جتنے لا سکا ساتھ لایا۔ باقی کو توڑ ڈالا، پانی میں ڈبو دیا، آگ میں جلا دیا۔

آخر برسوں کے بعد، جب میرے بال سفید ہو چکے تھے، امنگ، جوانی، زندگی کا ولولہ سب ختم ہو چکا تھا، ایک دن ہزار ہا پنجروں کے ساتھ لدا پھندا میں اپنے شہر واپس پہنچا۔ میں بہت

خوش تھا کہ دنیا میں پنجروں کا سب سے بڑا ذخیرہ میرے پاس ہے۔

لیکن واپس آنے کے پہلے ہی دن مجھے ہر دکان پر اور ہر مکان میں پنجرے نظر آئے۔ ان پنجروں میں رنگارنگ پرندے گردن ڈالے اڈوں پر بیٹھے تھے۔ پرندے پنجروں کے درودیوار سے سر ٹکرا رہے تھے۔ کرک کی التجائیں، طوطے کی چیخیں، قناری کی فریادیں پہلے سے زیادہ تیز تھیں۔ پنجرے اور ان میں اسیر حیوان لوگوں کی دولت وثروت کا نشان تھے۔ بہت ایسے تھے کہ انھیں کے ذریعے روزی کماتے تھے، بہت ایسے تھے کہ خوبصورت پنجروں، نایاب پرندوں، گھنے پروں والی مضبوط قناریوں، خوش آواز کرکوں اور پڑھائے ہوئے طوطوں کے مالک ہونے پر فخر کرتے تھے۔

پھر، اب میں کیا کرتا؟ نئے سرے سے سب کو خریدنا اور آزاد کرنا شروع کرتا؟ نہیں، وقت گذر چکا تھا۔ میری زندگی کے کتنے برس اسی دھن میں نکل گئے اور اس تمام کوشش اور دوادوش کے بعد میں دیکھ رہا تھا کہ پنجروں کی تعداد پہلے سے بھی بڑھتی ہوئی اور پرندوں کی فریاد پہلے سے بھی زیادہ دلخراش ہے۔ سکھائے ہوئے سہرے ایک شاہدانے کی خاطر مجبور ہیں کہ چونچ سے لفافے کھولیں اور ان میں سے لوگوں کی تقدیر کے نوشتے باہر نکالیں۔ میں نے دیکھا کہ کرکوں کے سر لہولہان ہیں، مینائیں پنجروں کی دیواروں پر ٹکریں مار رہی ہیں۔ قناریوں کے پر جھڑ رہے ہیں اور بلبلیں پنجروں کے گوشوں میں سر جھکائے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ طرقتے آئینے کے سامنے کھڑے اپنے جوڑے کی آرزو میں چیخ رہے ہیں اور اونگھتی ہوئی گوریاں ہر روز پنجرے کے در پر بھکارنوں کی طرح اپنے راتب کی منتظر ہیں۔

تماشائی! تو جو اس شہر یا کسی اور شہر سے یہاں کی سیر کرنے آیا ہے، اس بڑے پنجرے میں ہزاروں پنجرے دیکھتا ہے اور اچانک سوچنے لگتا ہے کہ تو خود اس پنجرے کا قیدی ہے۔ تو ان خالی پنجروں کو دیکھتا ہے اور ان حیوانوں کا تصور کرتا ہے جو ان میں رہ کر سختیاں اٹھا چکے ہیں۔ تو دروازے کی طرف جاتا ہے۔ تیرے دل میں ایک خوف ہے۔ اگر دروازہ بند ہوا، اگر کٹہرے کی سلاخیں تنگ اور مضبوط ہوئیں تو تو یہیں پھنس کر رہ جائے گا، چیخے گا، مدد کے لیے پکارے گا مگر کوئی سننے والا نہیں، کوئی فریاد کو پہنچنے والا نہیں۔ تو، تنہا اور مجبور، سلاخوں کے پیچھے سے، پنجرے کے اندر

سے باہر کا عالم دیکھ رہا ہے، آسمان پر بادل دوڑ رہے ہیں۔ دریاؤں اور ندیوں میں پانی بہہ رہا ہے، ہوائیں اور آندھیاں، پہاڑوں پر، دشت میں، چل رہی ہیں، گونج رہی ہیں۔ چڑیاں آزادی کے ساتھ اڑ رہی ہیں، لوگ آجا رہے ہیں اور تو نامعلوم مدت کے لیے اس پنجرے میں اسیر ہے۔ تیرے چہرے پر پسینہ آجاتا ہے، تیرے پیروں کی طاقت سلب ہوجاتی ہے اور تیرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ تو چاہتا ہے کہ سلاخوں کو گرفت میں لے کر آخری کوشش کرے، لیکن سلاخیں مضبوط ہیں اور تیرے بازو شل۔

تماشائی! ہراساں نہ ہو۔ اس پنجرے کا دروازہ ہرگز بند نہ ہوگا۔ تو جب چاہے بڑی آسانی کے ساتھ ان سلاخوں کے باہر جاسکتا ہے۔

تو اے تماشائی، تو بلاخطر پہلی اور دوسری منزلوں سے گذر کر اس پنجرے کی تیسری منزل پر چلا جا۔ یہاں بھی تجھے جگہ جگہ پنجرے نظر آئیں گے۔ لیکن اصلی پنجرہ، بڑا پنجرہ، چھت کے کڑے سے فانوس کی طرح لٹکا ہوا ہے۔ یہ پنجرہ فن کا شاہکار ہے اور بہترین کاریگروں نے کئی سال تک مسلسل اس پر محنت کی ہے۔ اس کے نقش و نگار دیکھ، اس کے بیل بوٹوں کے پیچ وخم دیکھ کس کمال کے ساتھ لوہے میں پیوست کیے گئے ہیں۔ سونے کے بنے ہوے ان پرندوں کو دیکھ جو پنجرے کے باہر کی چھت اور سلاخوں پر بیٹھے ہیں۔

پھر پنجرے کے اندر دیکھ۔ تعجب نہ کر۔ جیسا کہ تو دیکھ رہا ہے، ایک انسان کا پنجر ہے۔ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ خود کو کسی پنجرے میں قید کروں اور پھر خود ہی اپنا تماشائی بنوں، اس لیے میں گیا اور سچ مچ کا انسانی پنجر لے آیا۔ میں نہیں جانتا یہ کس کا پنجر ہے۔

میں نے وصیت کردی ہے کہ جب میں مرجاؤں تو میرے جسم کو جلادیا جائے اور میری راکھ کسی برتن میں بھر کر اسی پنجرے میں رکھ دی جائے۔ اگر میری وصیت پر عمل کیا گیا ہوگا تو تو اسے دیکھے گا۔

❀

اور تماشائی جب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچتا ہے تو اس کو بہت بڑا اور شاندار نقش و نگار سے

آراستہ پنجرہ اونچی چھت سے لٹکا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ پنجرہ کھڑکیوں سے آنے والی ہوا میں ہلتا رہتا ہے، اور جو انسانی پنجر اس میں بند ہے، اس کے ہاتھ پیروں اور کمر میں کمانیاں لگا کر اسے سلاخوں میں اس طرح باندھا گیا ہے کہ وہ پنجرے میں اِدھر سے اُدھر چکر لگاتا رہتا ہے۔ اور تماشائی جب غور سے دیکھتا ہے تو اسے شیشے کا ایک سر بند مرتبان بھی نظر آتا ہے جس میں کچھ راکھ اور جلی ہوئی ہڈیوں کے ٹکڑے بھرے ہیں۔

❊❊

(فارسی عنوان: ''قفسہا'')

بابا مقدم

مردہ سانپ

گھنی شاخوں اور ہری پتوں کی چھتری والا دارِ زعفران واحد درخت تھا جو لُرستان کے تختِ آب و اشیون کے علاقے میں نظر آتا تھا۔ کچھ دن ہوئے مجھے شوق پیدا ہوا کہ دار زعفران کو قریب سے جاکر دیکھا جائے۔ تخت آب میں خیمہ لگانے کے پہلے ہی دن میں نے ایک لرستانی سے اس درخت کا نام پوچھ لیا۔ اس سرزمین کے حد نگاہ تک پھیلے ہوئے پست و بلند میں یہ درخت پہچان میں آنے والا تنہا پیکر تھا جو ایک لمبے ٹیلے پر تنا کھڑا تھا، جیسے کوئی تماشاگر خود حیرت سے اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا ہو۔ راتوں کو جب اندھیرا اترنے لگتا تو سیاہ پڑتے ہوئے سرخ افق کے پیش منظر میں درخت ایک دو گھنٹے تک کسی اساطیری ہیولے کی طرح نظر آتا رہتا۔ اور رات کی سیاہی جتنی بڑھتی جاتی اور ستارے جتنے روشن ہوتے جاتے، وہ تاریکی میں ڈوبتا اور گھلتا جاتا۔ تاریکی نیچے کی گھاٹیوں سے اٹھتی ہوئی آتی اور درخت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

تیسرے دن میں نے درخت کے نزدیک جانے کا فیصلہ کیا۔ مغرب کے وقت میں نے چھڑی اٹھائی اور چل کھڑا ہوا۔ سیّد احمد، میرا خانساماں، بھی ہمراہ تھا۔ وہ کوئی پچیس سال کا ہوگا۔ اس کے پھولے پھولے گول زرد چہرے پر مہاسوں کی کثرت تھی اور اس کی اداس صورت میں اکیلی نمایاں چیز اس کی دھنسی ہوئی سوئی سوئی آنکھیں تھیں۔

سورج کی چمک اب آنکھوں کو چبھ نہیں رہی تھی۔ کسی پیلے تھال کی طرح وہ دور کی پہاڑیوں سے تھوڑا اوپر فضا میں معلق تھا۔ اس کے اوپر آسمان میں نکلے ہوئے چھدرے بادل کا رنگ کالا پڑتا جا رہا تھا۔ اس کی نچلی گوٹ البتہ ابھی سرخ تھی۔ میرے سامنے پھیلی ہوئی زمین پر نالیاں نالیاں سی بنی ہوئی تھیں اور اس پر اٹھے ہوئے ٹیلے مل کر سمندر سے ابھری ہوئی بڑی بڑی

مچھلیوں کی پیٹھوں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔

نیچے کی گھاٹیوں میں سائے گہرے ہو رہے تھے اور بلندی کی ماہی پشت زمین پر ہر طرف بکھری ہوئی کربی کی جھاڑیاں اور پتھروں کی سلیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ یوں تو دن بھر ہی یہ علاقہ ویران اور خاموش رہتا تھا لیکن غروب کے وقت اس کا سناٹا پر اسرار، وہم انگیز اور ڈراؤنا سا ہو جاتا تھا۔ نیچے سامنے والی گھاٹی سے ایک بنجارا اوپر جا رہا تھا اور اس سے کچھ آگے بڑھ کر کئی اور بنجارے ایک اور پہاڑی کی کمر پر چل رہے تھے۔ ایک کگارے کے چھوٹے سے ہموار قطعے پر کئی سیاہ خیمے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے اندر سے دھواں اوپر جا رہا تھا۔ ایک اور خیمے کے سامنے رہ رہ کر شعلے بھڑک رہے تھے۔

ہم ڈھلانوں سے اترتے ہوئے سایہ دار میدان میں پہنچ گئے اور تڑخی ہوئی زمین پر مشکل سے پیر جما جما کر ایک اور دامن سے اوپر چڑھتے ہوئے ٹیلوں کی روشن پٹی تک آ گئے۔ سورج نیچے اترتا جا رہا تھا جیسے کسی طلائی تمغے کی زنجیر کو آہستہ آہستہ ڈھیل دی جا رہی ہو۔ جتنی دیر ہم گھاٹیوں میں چلتے، دار زعفران نگاہوں سے اوجھل رہتا۔ ٹیلوں کے اوپر جا کر ہم اس کو دوبارہ دیکھتے اور اپنا راستہ اس کی جانب موڑ لیتے۔

ہم درخت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اوپر سے وہ چھتری کی طرح تھا، اور زمین کے پاس ہی اس کے تنے سے کئی شاخیں پھوٹی تھیں جو اوپر اٹھ کر تیلیوں کی طرح درخت کی چھتری کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ سورج ڈھل چکا تھا اور اب اپنے کنویں میں آخری غوطہ لگانے کو تھا۔ اس کی پھیکی نارنجی روشنی درخت کی چھتری اور تنے کی شاخوں سے چھنتی ہوئی زمین پر پڑ رہی تھی اور اس روشنی میں درخت کے نیچے کی ہموار زمین پر پڑے ہوئے سنگ پاروں کی پرچھائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ خود درخت کی پرچھائیں اس کے قریب کی زمین پر واضح تھی مگر کچھ آگے بڑھ کر دھندلی ہوتی گئی تھی۔ میں اور سید درخت کی پرچھائیں پر چلتے ہوئے زمین کے روشن دھبوں کے نزدیک پہنچ رہے تھے۔ درخت کی شاخوں پر سیکڑوں چھوٹی چھوٹی چڑیاں بول رہی تھیں۔

سیّد نے زور سے ہانک لگائی۔ اچانک چڑیاں بھرّا مار کر اڑیں اور درخت کے اوپر اوپر چتر کی طرح گھومنے لگیں۔ سورج کی ایک قاش غائب ہو چکی تھی اور بقیہ حصے کو آسانی سے نظر بھر

کے دیکھا جا سکتا تھا۔ اب اس کا رنگ سرخ تھا جیسے پگھلا ہوا لوہا ٹھنڈا ہو چلا ہو۔ اس کے اوپر ٹکا ہوا چھدرا بادل پورا سیاہ ہو گیا تھا۔ دارزعفران کے دوسری سمت تیز ڈھال کی صورت میں اترتی ہوئی زمین ایک گھائی تک چلی گئی تھی۔ جھٹپٹے میں کچھ بنجارے چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ ہوا کے ساتھ کسی بچے کی آواز رہ رہ کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں اور سیّد درخت کے نیچے تھے۔ میں درخت کی چکنی چھال پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور سیّد مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر گھوم گھوم کر درخت کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کی ڈری ڈری آواز بلند ہوئی:

"ارے، سانپ!"

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ سیّد نے ہاتھ سے ایک شاخ کی طرف اشارہ کیا۔

شاخ میں ایک سانپ لٹکا ہوا تھا۔

"لیکن مرا ہوا،" سیّد پھر بولا، "گڈریوں نے پھن کچل کر ڈال میں لٹکا دیا ہے۔"

شاخ کی جنبش کے ساتھ اس کے دونوں طرف لٹکا ہوا سانپ کا بدن بھی دھیرے دھیرے بل رہا تھا۔ پھن کچلے جانے کی وجہ سے اس کا منھ کھل گیا تھا۔ سرخ رنگ کا گوشت منھ سے باہر نکل آیا تھا، اسی میں کہیں اس کی آنکھیں بھی مل گئی تھیں اور اب ان کا پتا نہیں چلتا تھا۔ اس کی کمر بھی پھٹ گئی تھی، پتھر یا لاٹھی کا زخم تھا۔ سفید پیٹ پر کالی اور زرد چتیاں تھیں۔ باقی بدن پر سفید اور راکھی رنگ کے چھوٹے چھوٹے سفنے تھے۔ پتلا لمبا سانپ تھا اور اس کی گردن پر نقطے تھے جیسے گلوبند لپٹا ہوا ہو۔

سیّد، جو آگے بڑھ کر اسے دیکھ رہا تھا، بولا:

"مادہ ہے، گردن دیکھیے کتنی پتلی ہے۔ ان سانپوں کو مارنا نہیں چاہیے۔ جو مارتا ہے، ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ میں نے یہ سانپ دیکھے ہیں۔ کسی سے بولتے نہیں۔ اب دیکھ لیجیے گا، جس نے بھی اسے مارا ہے پائی پائی کو محتاج، جنگل بیابان کی خاک چھانتا، دردر بھٹکتا پھرے گا، جیسے میں پورے پانچ سال سے بھٹک رہا ہوں، اور ابھی پتا نہیں کہاں کہاں کا پانی لکھا ہے۔"

سورج کی بچی کھچی قاش بھی دور کے پہاڑوں کی اوٹ میں جا چھپی۔ گھاٹیاں تاریک ہو گئیں اور صرف ان کے حاشیوں اور ٹیلوں کی بلندی پر لالی باقی رہ گئی۔ اس کالے بادل کی گوٹ

اب کسی جھاڑی کی طرح معلوم ہو رہی تھی جس میں آگ لگ گئی ہو۔ چڑیاں اب بھی درخت کے اوپر اوپر چکر کاٹ رہی تھیں اور شاخ پر مردہ سانپ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ دور پر سفید دھبوں کے سے ہمارے خیمے بمشکل نظر آ رہے تھے۔ ہم درخت سے کچھ دور ہو گئے تو چڑیاں دھیرے دھیرے دو تین چکر کاٹ کر پھر درخت پر بیٹھ گئیں۔ ہم گھاٹی میں پہنچے تھے کہ ان کی چہچہاہٹ سنائی دی اور سیّد نے اپنی کہانی شروع کی:

کس کو یقین آ سکتا تھا کہ مجھے باورچی گیری کرنا پڑے گی۔ میرے ابا بیوپاری تھے۔ خرم آباد میں سب ان کو جانتے پہچانتے تھے۔ اب بھی، اتنے برسوں بعد بھی، وہاں ان کا نام لیجیے تو سب سوداگروں کو یاد آ جائے۔ کنبے میں بس میں تھا اور میری ماں اور مجھ سے بڑی ایک بہن جو بیاہ کر سسرال کی ہو گئی تھی۔ میں ابھی چھوٹا تھا۔ اسکول میں پڑھتا تھا۔ میرے ابا تہران سے مال لا کر بیچتے تھے۔ اچھا بھلا کاروبار تھا۔ بہت سے لوگ تو ہم سے جلتے تھے۔ میری ماں دھیمے مزاج کی بے زبان عورت تھی۔ بچپن ہی سے میں دیکھتا تھا کہ اس کے دل میں کچھ ہے جو وہ کسی کو بتاتی نہیں۔ دن میں دو بار وہ اس کوٹھری کے اندر ضرور جاتی تھی جو ہمارے مکان کے بڑے کمرے کے پیچھے تھی۔ وہاں جا کر وہ اندر سے دروازہ بند کر لیتی اور کچھ دیر تک وہیں رہتی تھی۔ مجھ کو اس نے وہاں جانے سے منع کر رکھا تھا۔ کہتی تھی بچوں کو اندھیری جگہوں پر نہ جانا چاہیے۔ میں خود ہی اندھیرے سے ڈرتا تھا اس لیے میرا کبھی وہاں جانے کو جی بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھ کو اتنا پتا تھا کہ اس کوٹھری میں میرے ماں باپ کے کپڑوں کے دو پرانے صندوق ہیں اور ایک بکس، ایک سماور اور کچھ اور سامان۔

ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی جھری میں سے کوٹھری کے اندر جھانکا بھی تو مجھے سامنے کے طاقچے میں رکھے سماور کی چمک نظر آئی، بس۔ غرض وہ کوٹھری مجھے ایک اندھیری اور ڈراونی جگہ معلوم ہوتی تھی اور مجھ کو اس کے اندر قدم رکھنے کی ذرا بھی خواہش نہ ہوتی تھی۔

جاڑوں کی ایک رات کی بات ہے، میں اسکول کا کام کرتے کرتے تھک کر کرسی[1] کے نیچے جا لیٹا اور سو گیا۔ ابا ابھی آئے نہیں تھے اور ہم نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ معمول یہ تھا کہ ابا کے

[1] کرسی: بڑا سا اونچا تخت جس پر اس سے بہت بڑی پوشش ڈال دی جاتی ہے۔ جاڑوں میں گھر والے اسی پوشش اور تخت کے نیچے سوتے ہیں۔ برقی حرارت کے رواج سے پہلے گھروں میں کرسی کا استعمال عام تھا۔ (مترجم)

آنے کے بعد سب ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ شاید بھوک ہی کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر نکلا کہ ماں سے کھانا مانگوں۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کرسی کے اوپر ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ طاقچے میں جلتے ہوئے چراغ کی روشنی کرسی پر پڑ رہی تھی۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کوئی رسی وسی ہے، لیکن جب اس نے پھن اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں ایک چیخ مار کر پھر کرسی کے نیچے گھس گیا۔ ماں کمرے کے باہر تھی، میری آواز سن کر آ گئی۔ اس نے مجھے کرسی کے نیچے سے کھینچ کر نکالا۔ میں نے جب اس کو ساری بات بتائی اور قسم کھا کر کہا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے کرسی پر سانپ دیکھا ہے تو وہ مجھ کو بہلانے لگی کہ میں نے خواب دیکھا ہوگا ورنہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا تھا۔ مجھ کو یقین تھا کہ میں نے کرسی پر سانپ ہی دیکھا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس رات میں بڑی بے چین نیند سویا۔ دوسرے دن اسکول جاتے ہوئے میرے دل میں سانپ دیکھنے کی دہشت سمائی ہوئی تھی۔ کلاس میں بھی سارے وقت میری آنکھوں کے سامنے وہی منظر رہا کہ سانپ کنڈلی مارے ہوئے ہے اور پھن اٹھا کر مجھے دیکھ رہا ہے۔

چھٹی کے بعد مجھ کو گھر جاتے ڈر لگ رہا تھا۔ دیر تک گلی کوچوں میں مٹر گشتی کرتا رہا۔ تھک گیا تو ایک مکان کی چبوتریا پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ ماں گھبرائی ہوئی مجھ کو گلیوں میں ڈھونڈھتی پھر رہی ہے۔ وہ بہت پریشان تھی، کہتی جاتی تھی کہ سارے شہر کی خاک چھان ڈالی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی لپک کر آئی اور اس آوارہ گردی کا سبب پوچھنے لگی۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ گھر میں جو سانپ نکلا تھا اس سے مجھ کو ڈر لگ رہا ہے اور اب میری وہاں جانے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تھپکنے لگی اور بولی:

''بیٹے، ڈرو نہیں۔ آؤ، گھر چلیں۔ تم نے کچھ اور دیکھا ہوگا، نیند میں تو تھے۔ اور پھر سانپ سے ڈرنا کیا۔ اگر تھا بھی تو ہمارے ہی یہاں کا تو سانپ تھا۔ وہ گھراتی سانپ تھا۔ گھراتی سانپ کسی کو ستاتا نہیں۔ سب گھروں میں سانپ کا ایک ایک جوڑا تو ہونا ہی چاہیے۔''

پھر اس نے مجھ کو لے جا کر بازار سے گیہوں کی کھیلیں اور بتاشے دلوائے۔ ہم ساتھ ساتھ گھر لوٹے۔ راستے میں اس نے مجھے تاکید کی کہ سانپ والی بات کسی کو نہ بتاؤں۔ میں نے بھی وعدہ کر لیا۔

اس قصے کو دن گذر گئے اور سانپ والی بات میرے لیے ایسی ہی ہوکر رہ گئی جیسے آدمی کسی پرانے زخم کی دُکھن کا عادی ہو جائے۔ مگر اس کے بعد سے میں کبھی گھر میں یا کمرے میں اکیلا نہیں رہتا تھا۔ ہمیشہ ماں کے پہلو سے لگا رہتا اور اسی کے ساتھ مکان میں اِدھر اُدھر آتا جاتا تھا۔ تہہ خانے اور خاص کر کوٹھری کا تو رخ بھی نہ کرتا تھا۔ میں کھٹک گیا تھا کہ جو بھی ہے وہ اسی اندھیری کوٹھری میں ہے جس کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے اور صرف ماں اس کے اندر جاتی ہے۔

آخر ایک رات ماں مجھ سے کہنے لگی:

''بیٹے، تمھیں ایک بات بتانا ہے۔ اب تم سیانے ہو گئے ہو اور ضرور ہے کہ تم بھی وہ بھید جان لو اور کسی اور کو نہ بتاؤ۔''

میرا دل بولنے لگا کہ بات اسی سانپ کی ہے۔ میرا چہرہ فق ہو گیا اور بدن تھرتھرانے لگا۔ ماں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی:

''آخر تو تمھیں پتا چلنا ہی ہے، اسی گھر میں جو رہتے ہو، اور کسی نہ کسی دن وہ تمھیں دکھائی دے جائیں گے۔''

میں ماں سے چمٹا ہوا کھڑا سن رہا تھا، لیکن میرا جی چاہا کہ اس کے پاس سے بھاگ کھڑا ہوں۔ مجھے ماں سے بھی ڈر لگنے لگا تھا، جیسے اس نے خود اپنے پاس کہیں سانپ چھپا رکھے ہوں۔ وہ مجھ پر جھکی ہوئی بول رہی تھی اور اس کی گرم سانس مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میرا ہاتھ پسینے سے تر ہو گیا اور مجھے چکر آنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری ماں کے کپڑوں میں سے ابھی ابھی کوئی سانپ سرسراتا ہوا گرے گا اور سیدھا مجھ پر لپکے گا۔

ماں کہہ رہی تھی:

''لال، آخر تو تم ان کو دیکھو ہی گے۔ اب ان سے دوستی کرنا سیکھ لو۔ وہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ جانتے ہو، زیادہ تر مکانوں میں گھراتی سانپ ہوتے ہیں مگر کوئی کسی کو بتاتا نہیں۔ ہمارا نصیبہ انھیں کے دم سے ہے۔ وہ ہمارے گھر کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کوٹھی میں رہتے ہیں۔ دو ہیں۔ انھیں میں کا ایک تھا جسے تم نے اس رات کرسی پر دیکھا تھا۔ دوسرا نیچے کرسی کے اُس طرف تھا، تمھیں دکھائی نہیں دیا۔ تم چیخ پڑے اور میں آئی تو وہ چلے گئے۔ انھیں شاید خود

بھی پتا ہے کہ تم ان سے ڈرتے ہو۔ اسی لیے تو وہ تمھارے سامنے آتے نہیں۔''

ماں کی باتیں سن کر میں ڈر سے کانپنے لگا، منھ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ لیکن بھاگ کر جاتا کہاں۔ اکیلے میں ڈر لگتا تھا۔ کچھ بھی ہو، میں کم سے کم وہاں اپنی ماں کے ساتھ تو تھا۔

بہت کہہ سن کر آخر ماں نے مجھے راضی کر لیا کہ اس کے ساتھ چلوں اور سانپوں سے کچھ کچھ آشنائی پیدا کروں۔ میں دونوں مٹھیوں میں اس کے دامن کو جکڑے ہوے تھا اور وہ مجھے آہستہ آہستہ آگے بڑھا رہی تھی۔ اس نے کوٹھری کے دروازے کی کنڈی کھولی تو میں نے اس کے لباس میں منھ چھپا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ماں نے ایک کنارے ہو کر میرا چہرہ کوٹھری کی طرف گھما دیا۔ دروازے کے کھلے ہوے پٹ سے آتی ہوئی مدھم روشنی کی چادر سی کوٹھری کے فرش پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا تھا اور انگلیوں کے بیچ سے دیکھ رہا تھا۔ اس روشنی میں مجھے دو سانپوں کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت سر دکھائی دیے۔ دونوں نے منھ اوپر اٹھا لیے تھے اور ہم کو ٹک ٹک دیکھ رہے تھے۔

ماں کہہ رہی تھی:

''یہ داہنی طرف والا وہی ہے جو تمھیں دکھائی دیا تھا۔ یہ ہمیں ذرا بھی پریشان نہیں کرتے۔ گھر میں ہر طرف آتے جاتے ہیں۔ برسوں سے ہمارے ساتھ ہیں۔ تمھیں بھی ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ دیکھو نا، کیسا تمھیں دیکھ دیکھ کے حیران ہو رہے ہیں۔ اگر میں ساتھ نہ ہوتی تو دونوں بھاگ کر چھپ گئے ہوتے۔ نئے لوگوں کے سامنے بالکل نہیں آتے ہیں، لیکن تم تو گھر ہی کے ہو۔ اب بڑے ہو رہے ہو۔ چاہیے کہ انھیں اچھی طرح پہچان لو اور یہ بھی تم سے ہل جائیں۔ ہمارا نصیبہ انھیں کے دم سے ہے۔ اور دیکھو بیٹے، کہیں ایسا نہ ہو کسی کے سامنے منھ سے یہ بات نکال بیٹھو کہ ہمارے یہاں سانپ ہیں۔ کسی کو بھی ان کے ٹھکانے کا پتا نہ دینا۔ اپنے ابا کو بھی نہیں۔ بہن کو بھی نہ بتانا۔ وہ خود جانتے ہیں مگر کسی سے کہتے نہیں۔''

پھر وہ آہستہ سے کوٹھری میں داخل ہوئی اور میں اکیلا دروازے پر کھڑا رہ گیا۔ میں دیوار سے لگا ہوا کانپ رہا تھا۔ ماں سانپوں کے قریب پہنچی تو وہ دھیرے دھیرے رینگتے ہوے آگے بڑھے۔ دونوں ایک ایک طرف سے اس کی پنڈلیوں میں لپٹ گئے اور اس کی جوتیوں اور شلوار

کے پائینچوں پر سر رگڑنے لگے۔ ماں ان سے باتیں کر رہی تھی جیسے لوگ پالتو پرندوں اور جانوروں سے باتیں کرتے ہیں۔ زمین پر پانی کا برتن اور کھانے کا کچھ سامان تھا۔ تھوڑی دیر بعد ماں باہر نکل آئی اور کہنے لگی:

''دیکھا بیٹے، کیسے اچھے اور غریب سانپ ہیں! اب تم ان کے عادی ہو جاؤ گے۔ انھوں نے بھی تم کو پہچان لیا ہے اور اب تم سے بھاگا نہیں کریں گے۔ اگر کسی دن ان کے پاس جاؤ اور انھیں پریشان نہ کرو تو وہ اسی طرح تمھارے بھی لپٹیں گے اور تمھارے پیروں پر سر رکھ دیں گے۔''

ماں نے کہہ تو دیا تھا کہ سانپ میرے دوست بن گئے ہیں لیکن میں خود کو اس پر کبھی تیار نہ کر سکا کہ کوٹھری میں جاؤں اور ان کو دیکھوں۔ ان کا اس گھر میں ہونا میرے لیے مستقل عذاب تھا۔ میں ہر وقت سہما سہما رہتا تھا۔ ذرا سی آواز پر میرا دل بیٹھنے لگتا۔ مجھے وہم ہو گیا تھا کہ ایک نہ ایک دن سانپ مجھ کو ڈس لیں گے۔ مجھے دکھائی دینے لگتا کہ ڈسے جانے کے بعد میرا بدن پھول گیا ہے اور میں تکلیف سے بل کھا رہا ہوں۔ اسی لیے میں کسی بھی وقت گھر میں اکیلا نہیں رہتا تھا۔ کوئی رات نہ جاتی تھی کہ میں ہول اور ہراس کے بغیر چین کی نیند سو سکوں۔ اکثر سوتے سے چونک کر اٹھ بیٹھتا اور اپنے بستر کو غور سے دیکھنے لگتا تھا۔

ہمارے کمرے کی چھت لکڑی کی تھی۔ چھت پر کڑیاں ڈال کر ان پر نرکل اور لکڑی کی چھیلن جمائی گئی تھی۔ اس زمانے میں میرا ایک کھیل یہ بھی تھا کہ چت لیٹ جاتا اور چھت کی کڑیوں کو دونوں جانب سے گنا کرتا تھا۔ میں ساری کڑیوں کو ان کے رنگوں، ان کی موٹائی پتلائی، ان کے رخنوں اور گانٹھوں سمیت پہچانتا تھا۔ ایک زمستانی رات جب ہم کھانا کھا چکے تھے، میں اپنی جگہ پر لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے اسکول اور کلاس کے بارے میں سوچتا ہوا میں کڑیوں کو ایک ایک، اور دو دو، اور کبھی ایک ایک چھوڑ کر گن رہا تھا۔ اسی میں ایک بار جب میں بیچ کی کڑیوں کی جوڑی پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک کڑی میں کوئی چیز لٹکی ہوئی دھیرے دھیرے ہل رہی ہے۔ یہ نئی چیز تھی جسے میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ کوئی نرکل یا چھیلن اپنی جگہ سے باہر لٹک پڑی ہے، لیکن فوراً ہی پتا چل گیا کہ انھیں میں کا ایک سانپ ہے جو چھت پر پہنچ گیا ہے۔ ایک گز سے زیادہ اس کا بدن چھت سے لٹکا ہوا تھا اور وہ نیچے دیکھ رہا تھا۔ میں اچھل کر کھڑا

ہو گیا اور کمرے کے ایک کونے میں جا چھپا۔ میری زبان بند ہو کر رہ گئی تھی۔ ابا اور اماں نے بھی سانپ کو دیکھ لیا تھا اور اب حیران حیران سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، لیکن کچھ بولے نہیں۔ آخر ابا اٹھ کر آئے اور ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ میں ڈر کے مارے کرسی کے نیچے گھس گیا اور وہیں مجھے نیند آ گئی۔

کچھ دن بعد ابا نے ایک اچھا سا مکان مول لے لیا اور ہم اسباب سمیت وہاں چلے گئے۔ میں بہت خوش تھا اور سمجھ رہا تھا اب ہمیں سانپوں کی علت سے چھٹکارا مل جائے گا اور مجھے کوٹھری، اور تہہ خانے، اور کمروں کی چھتوں، اور اپنے بستر، اور گھر کے کسی بھی حصے سے ڈر نہیں لگے گا اور میں بے کھٹکے ہر جگہ آ جا سکوں گا اور راتوں کو آرام سے سویا کروں گا۔ لیکن میرا خیال غلط تھا۔ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ سانپوں کا وہی سا جوڑا ہم سے پہلے ہی اس گھر میں پہنچ چکا ہے۔ اب پھر ماں کا کام ان کی خدمت کرنا تھا۔ وہ روز ان کو دیکھنے جاتی اور ان کی خوراک پہنچاتی۔ پھر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں اس مکان میں رہنے پر مجبور تھا۔ میرے ماں باپ وہاں تھے، میرے سونے کا ٹھکانہ وہاں تھا، وہی ایک جگہ تھی جہاں ہم کو صبح شام کا کھانا کھانا تھا اور سردی گرمی میں چھت کے نیچے پناہ لینا تھی۔ اب مجھ کو یقین ہو گیا تھا کہ ہر گھر میں سانپ کا ایک جوڑا ضرور رہتا ہے اور گھر والے مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ گزارہ کریں، انھیں کھانے کو دیں اور دوسروں کو ان کے بارے میں کچھ نہ بتائیں اور اس بات کو راز کی طرح اپنے سینے میں چھپائے رکھیں۔ اگر مجھ کو کسی کے چہرے پر فکر یا پریشانی نظر آتی اور ایسا محسوس ہوتا کہ اسے کوئی دھڑکا لگا ہوا ہے تو میں اپنے آپ سے کہتا، ہو نہ ہو اس میرے یار کو اپنے گھر کے سانپ دکھائی دے گئے ہیں اور اب ڈر کے مارے اس کی جان پر بنی ہوئی ہے، اس لیے کہ جس دن سے میں نے سانپوں کو دیکھا تھا خود میری یہی حالت تھی۔

ایک دن سہ پہر کے وقت میں اسکول کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا کودتا گھر لوٹ رہا تھا۔ راستے میں زمین کا بڑا سا ہموار قطعہ پڑا جس میں بچے کھیل رہے تھے۔ ہم بھی کبھی کبھی اسکول سے لوٹتے میں دیر دیر تک اس میدان میں دوڑیں لگاتے اور اگر گیند پاس ہوتی تو گول بنا کر فٹ بال کھیلتے تھے۔ اس روز ہم وہاں پہنچے تو ایک لڑکے کو میدان کے کنارے ایک سانپ پڑا نظر آیا

جسے مار دیا گیا تھا۔ لڑکے نے اسے اٹھالیا۔ زرد رنگ کا لمبا سا سانپ تھا۔ اس کا پھن کسی چیز سے کچل دیا گیا تھا۔ لڑکے نے سانپ کو دم سے پکڑ رکھا تھا۔ اور اسے گھما گھما کر دوسرے لڑکوں کو ڈرا رہا تھا۔ جو لڑکے ڈر رہے تھے وہ تو بھاگ کھڑے ہوے اور جنھیں ڈر نہیں لگا وہ اطمینان سے کھڑے رہے اور سانپ ان کے بدن پر لگتا رہا۔ لڑکے نے سانپ میری طرف بڑھایا تو میں چیخ مار کر بھاگا۔ سب لڑکے ہنسنے اور میرا مذاق اڑانے لگے۔ آخر اس لڑکے نے سانپ کو ایک گڑھے میں ڈال دیا اور ہم آگے بڑھے۔ راستے میں بھی انھوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا اور یہ کہہ کہہ کر میری ہنسی اڑاتے رہے کہ میں مرے ہوے سانپ سے بھی ڈرتا ہوں اور اسے چھونے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اب جو ہم جنوں کے سامنے میری کرکری ہوئی اور سانپ سے میرے ڈرنے کا حال سب کو معلوم ہو گیا تو میری غیرت کو جوش آ گیا۔ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ میں سب میں بوداٹھہروں اور ڈرپوک کہلانے لگوں، اس لیے میں نے کہہ دیا کہ مردہ سانپ سے ڈرنا کیسا، میں تو زندہ سانپ سے بھی نہیں ڈرتا، اور اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کی دھن میں یہ بھی بتا گیا کہ ہمارے مکان میں دو دو سانپ ہیں جو ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں اور میں ان کے پاس چلا جاتا ہوں اور انھیں ہاتھ سے چھوتا ہوں۔ میری بات سن کر سب ہنس پڑے اور پھر میرا مذاق اڑانے اور مجھ کو جھوٹا بنانے لگے۔ میں انگاروں پر لوٹ رہا تھا اور خون کے گھونٹ پی رہا تھا، کہہ بیٹھا اگر تم لوگ مجھے جھوٹا سمجھتے ہو اور میری بات کا اعتبار نہیں کرتے تو میں تمھیں وہ سانپ دکھا سکتا ہوں۔ چلو، سب مل کر میرے یہاں چلو۔ وہ سب کے سب خوشی سے چیختے ہوے راضی ہو گئے اور میرے گھر کی طرف چل پڑے۔ ذرا دیر میں گھر آ گیا۔ ماں گھر پر موجود نہیں تھی۔ راستے بھر مجھے اس کا یہ کہنا یاد آتا رہا کہ سانپوں کے بارے میں نہ تو کسی سے کچھ کہوں، نہ کسی کو ان کا پتا نشان بتاؤں۔ لیکن اب معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا اور پھینکے ہوے پانی کو اٹھایا نہیں جا سکتا تھا۔

اگر اب میں لڑکوں کو سانپ نہ دکھاتا تو وہ اسکول میں میری جان کو آ جاتے اور میں ہمیشہ کے لیے بزدل اور جھوٹا ہونے کی شرم میں مبتلا رہتا۔

میں نے سیڑھیاں چڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ لڑکے میرے پیچھے پیچھے تھے۔ صرف ہمارے پیروں کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ سب خاموش اور دم سادھے ہوے تھے۔ میرا دل

سینے میں اس طرح دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ میں اس کی آواز سن سکتا تھا۔ سانپوں کا سامنا کرنے کے خیال سے میرے ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ آ گیا تھا اور پیر کانپ رہے تھے۔ کوٹھری کے دروازے پر پہنچا تو اس کی کنڈی کھولنے کے لیے میرا ہاتھ نہیں اٹھ رہا تھا، لیکن سب لڑکے میرے پیچھے کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ جس لڑکے نے میدان میں مردہ سانپ اٹھایا تھا وہ آگے بڑھا اور بولا:

''میں سمجھ گیا۔ تمھارے یہاں گھراتی سانپ ہیں۔ مگر گھراتی سانپ تو کسی کو دکھائے نہیں جاتے۔ خیر، اب دروازہ کھولو۔ ذرا دیکھیں تو۔''

اور مجھے ہچکچاتے دیکھا تو اس نے خود آگے بڑھ کر ایک دم سے دروازہ کھول دیا۔

سب لڑکے گردنیں بڑھا بڑھا کر کوٹھری کے اندر دیکھنے لگے۔ کوٹھری کے فرش پر پانی کا برتن اور کھانے کا سامان تو تھا لیکن سانپوں کا کہیں پتا نہ تھا۔ کچھ لڑکے دبے پاؤں اندر داخل ہوئے اور ہر طرف دیکھنے لگے، مگر سانپ گویا کبھی وہاں تھے ہی نہیں۔ ایک کونے میں ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی تھی، طاقچوں میں کچھ برتن اور دوسرا کاٹھ کباڑ، اور بس۔ کچھ لڑکوں نے پانی کا برتن اور کھانا دیکھ کر وہاں سانپوں کا ہونا مان لیا، لیکن بعض پھر بھی میری ہنسی اڑاتے رہے۔

لڑکوں کے جانے کے بعد میری بھی گھر میں ٹھہرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ماں کے آنے تک میں گلی میں گھومتا رہا اور ہم دونوں ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ میں اپنے گھر اور اپنی زندگی کا راز ظاہر کر دینے سے پریشان تھا، اس لیے زبردستی دو تین نوالے حلق سے اتار کر جلدی ہی سو گیا۔

دوسرے دن میری ماں معمول سے پہلے ہی گھبرائی ہوئی جاگ پڑی۔ اس کی عجیب حالت تھی، چہرے کا رنگ اڑا ہوا اور آنکھیں کچھ ایسی ہو رہی تھیں کہ ان کی طرف دیکھتے ڈر لگتا تھا۔

وہ کچھ دیر تک کسی سوچ میں گم رہی، پھر لپک کر کوٹھری میں گئی اور ایک دو منٹ تک اندر رہی۔ میں سانس روکے ماں کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا اب کیا ہوگا، کیا اسے وہاں سانپ ملیں گے؟ کبھی سوچتا کہ سانپ غائب ہو گئے ہوں گے اور ماں سمجھ جائے گی کہ میں نے کیا حرکت کی ہے۔ وہی ایک موقع تھا جب میرا دل چاہا کہ سانپ موجود ہوں اور ماں کو دکھائی

دے جائیں۔ میں جانتا تھا کہ سانپوں سے پیچھا چھڑانے کا یہ صحیح طریقہ نہیں تھا۔ ذرا دیر بعد ماں باہر نکلی، کچھ دیر تک مجھ کو غور سے دیکھتی رہی، پھر ابا سے بولی:

''کچھ پتا ہے؟ سانپ گئے! رات خواب میں آئے تھے۔ کہہ رہے تھے لوگ ان کا ٹھکانہ جان گئے ہیں اس لیے وہ ہمارے یہاں سے جا رہے ہیں، ہمیشہ کے لیے، اور اب ہم پر جو کچھ بھی پڑے گی اس کے ذمہ دار ہم خود ہوں گے۔ بار بار میری آنکھ کھلتی اور میں صلوات پڑھ کر اور شیطان پر لعنت بھیج کر سو جاتی تھی، لیکن ہر بار یہی خواب آتا تھا۔ صبح تک ٹھیک سے سو نہیں سکی۔ اب کوٹھری میں جا کر جو دیکھا تو خواب سچا تھا۔ سانپ گئے۔ کہیں پتا نہیں۔ میں سمجھتی ہوں اسی لڑکے نے کوئی گل کھلایا ہے۔''

پھر اس نے ڈانٹ کر مجھ سے معاملہ پوچھا۔ میں نے بھی جو کچھ ہوا تھا سب کا سب بتا دیا۔ ماں نے یہ ماجرا سنا تو اس کے سینے سے ایک آہ نکلی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں اس کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے اس نے مجھے زیادہ کچھ تو نہیں کہا لیکن اتنا ضرور کہا:

''بیٹے، تم نے ہماری زندگی برباد کر دی۔ ہمارے گھر کا اقبال رخصت کر دیا۔ بدنصیبی کو دعوت دے دی۔ مجھے ڈر ہے اب تھوڑے ہی دن میں ہم محتاج اور دربدر ہو جائیں گے۔ یہ سانپ پشتوں سے ہمارے یہاں چلے آ رہے تھے۔ ہمارے گھر کے نگہبان تھے۔ انھیں شاید پتا تھا کہ تم ان کو بھگا کر رہو گے۔ ان کا دل تم سے نہیں مل رہا تھا، اسی لیے وہ تم سے دور دور رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ تم کو اپنی زبان پر قابو نہیں، گھر کا راز نہیں چھپا سکتے۔ آخر تم نے وہی کیا جس کا مجھے ڈر تھا۔ سانپ گئے، اور ہم بے سہارا رہ گئے۔ مجھے تو یہ بھی ڈر ہے کہ خدا نہ کرے وہ تمھیں کچھ آزار نہ پہنچا دیں۔''

کئی دن تک میں سخت وحشت میں گرفتار رہا اور ڈرتا رہا کہ کہیں مجھے کوئی سانپ ڈس نہ لے۔ ماں نے مجھ کو بہن کے گھر بھیج دیا۔ کئی دن تک وہیں رہا، اپنے گھر میں قدم نہیں رکھا۔ یہاں تک کہ ایک ہفتے بعد ماں نے آ کر بتایا کہ اسے پھر خواب میں سانپ نظر آئے ہیں اور انھوں نے کہا ہے کہ اگرچہ ان کو ہمارا گھر چھوڑ دینا پڑا ہے لیکن وہ ہم سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے اور مجھ سے بھی نہیں بولیں گے۔ اس لیے ماں مجھے گھر لے گئی۔

اس قصے کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ میرے ابا کا کاروبار الٹ پلٹ ہوگیا۔ تہران سے جو مال وہ بیچنے کو لائے تھے اس کا مندا پڑ گیا اور بکری نہیں ہوسکی۔ ابا نے نقصان بھرنے کے لیے دوسرے دھندوں میں ہاتھ ڈالا لیکن سب میں گھاٹا ہی گھاٹا رہا۔ شہر بھر میں بات پھیل گئی کہ ابا دیوالیے ہوگئے، اور لین دار ان پر چڑھ دوڑے۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا سب ہاتھ سے جاتا رہا۔ مکان تک نکل گیا۔ وہ شخص جس کے بھاگوان ہاتھوں کی دھوم تھی اور جو مٹی کو چھو دیتا تو سونا ہو جاتی، اس کا ایسا وقت بگڑا کہ کرائے کے ایک کمرے میں زمین پکڑ کے بیٹھ رہا اور تھوڑے ہی دن میں مر گیا۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ پریشانیوں اور کوفت نے ابا کی جان لے لی، لیکن جن لوگوں کو سانپوں کے معاملے کی خبر تھی وہ جانتے تھے کہ اس بدبختی اور سیاہ روزی کا اصل سبب میں ہوں۔

باپ کے مرنے کے بعد مجھ کو اسکول چھوڑنا پڑا۔ مدت تک ڈرائیوری کی، اِس شہر سے اُس شہر دوڑتا پھرا۔ جان کھپا کر اور دوسرے ڈرائیوروں کی گالیاں کھا کھا کر پیسے جمع کیے اور ایک ٹیکسی خریدی۔ شہر کے باہر کی بستیوں کے پھیرے کرتا تھا۔ کام چل نکلا اور قریب تھا کہ جم جاؤں اور گھر بسا لوں۔ ماں بھی بڑی خوش تھی۔ مگر ایک دن شام کے وقت جب میں سواریاں بٹھائے واپس آ رہا تھا۔ شہر کے قریب ایک موڑ اترتے ہوئے میری نگاہ اچانک ایک مردہ سانپ پر پڑ گئی جس کا پھن کسی گاڑی کے نیچے آکر چپٹی ہوگیا تھا۔ بالکل ویسا ہی سانپ تھا جیسے ہمارے یہاں تھے۔ دم بھر میں ایک عجیب سی دہشت سے میرا بدن کپکپا گیا۔ میں نے گاڑی کو ایک طرف کاٹا کہ سانپ اس کے نیچے نہ آنے پائے۔ اس طرف ایک بڈھا اپنے خچر پر ڈھیروں لکڑیاں لادے پہاڑ سے اتر کر شہر جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ دونوں کو روند ڈالوں۔ جلدی سے میں نے گاڑی کو پھر دوسری جانب کاٹا۔ اتار کا راستہ تھا، بریک ماروں تو گاڑی الٹ جائے۔ اور ہوا یہی۔ ایک دو لڑھکنیاں کھا کے ہم ایک کھڈ میں جا پڑے۔ مسافروں میں سے دو وہیں کے وہیں ختم ہوگئے، دو تین زخمی بھی ہوئے۔ میرا بھی ہاتھ ٹوٹ گیا، اور گاڑی تو ایسی مٹی کہ کسی کام کی نہ رہی۔

اس لیے میں نے سمجھ لیا کہ دوڑنے دھوپنے سے کچھ نہیں ہونا، اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب وہ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ میں نے آوارہ گردی شروع کر دی۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں، دو نوالوں کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اب خانساماں ہوگیا ہوں۔ ماں اکیلی بیٹھی میری لگائی

ہوئی آگ میں جل رہی ہے۔ جب میری حالت پر اس کا بہت دل کڑھتا ہے تو کہتی ہے:

''بیٹا، تم نے ہمیں بھی برباد کیا، خود بھی کہیں کے نہ رہے۔''

❄

ہم آخری پہاڑی چڑھ رہے تھے۔ ہمارے خیمے تھوڑی ہی دور رہ گئے تھے۔ مغربی افق کی سرخی سیاہی میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ کالے بادل نے کسی بہت بڑے اژدہے کی طرح دارِ زعفران کی چھتری کو نگل لیا تھا۔ درخت کا تنا یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے آگ کے شعلوں میں کوئی ہاتھ پھیلائے کھڑا ہو۔

سیّد نے کہا:

''اور آج، قسمت کا لکھا یہ تھا کہ ہم اس درخت کو دیکھنے جائیں اور وہاں ہمیں مردہ سانپ دکھائی دے جائے۔ یہ اشارہ ہے اس کا کہ مجھ کو جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ جاتا ہوں، بستر باندھ لوں۔ کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔''

❄❄

(فارسی عنوان: ''لاشۂ مار'')

جمال میر صادقی

کنکریٹ کے انباروں کے اُدھر

ایک دن صبح مسٹر عارفی دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلے تو ان کے ساتھ یہ عجیب معاملہ پیش آیا۔

مسٹر عارفی شہر کے شمالی علاقے میں جدید وضع کے ایک نوتعمیر مکان میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کی عمر چالیس پینتالیس سال کی رہی ہوگی۔ چھوٹا قد، ڈھلکے ہوے کندھے، پچکا ہوا پیٹ، دبلا بدن، چلتے میں ان کے ہاتھ دونوں طرف بے جان سے جھولتے رہتے تھے۔ مسٹر عارفی تھوڑا آگے جھک کر تیز تیز قدموں سے چلتے تھے۔ ان کے بدن کی خمیدگی ان کی پرچھائیں میں بھی ظاہر ہوتی تھی اور مسٹر عارفی کو ایسا نظر آتا تھا کہ کوئی کبڑا ٹھنگنا، چوڑا چکلا آدمی کبھی ان کے برابر برابر، کبھی آگے آگے چل رہا ہے۔

مسٹر عارفی کتھئی رنگ کا معمولی سا کوٹ پتلون پہنے اور ہلکی بادامی ٹائی باندھے ہوے تھے۔ قمیص کا کلف دیا ہوا سفید کالر کوٹ سے ایک انگل اوپر نکلا ہوا تھا۔ مسٹر عارفی اپنے لباس اور ظاہری ہیئت کی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے۔ اگر ان کی جوان بیٹی ان کا خیال نہ رکھتی تو انھیں ہفتوں قمیص بدلنے یا کوٹ پتلون پر استری کرنے کا دھیان بھی نہ آتا۔

مسٹر عارفی حسبِ معمول اپنا بڑا سا بھاری بیگ تھامے، آگے کو جھکے ہوے، گلیوں اور مکانوں کو ایک ایک کر کے پیچھے چھوڑتے، لمبے لمبے قدم بڑھاتے لپکے چلے جا رہے تھے۔

انھوں نے عادت بنائی تھی کہ سویرے اٹھ بیٹھتے اور جلد سے جلد گھر سے نکل کھڑے ہوتے تھے تاکہ بسوں کی بھیڑ بھاڑ میں نہ پھنسیں اور ہمیشہ ٹھیک وقت پر دفتر پہنچ کر حاضری رجسٹر پر دستخط کر دیں۔

مسٹر عارفی کا مکان شاہراہ سے دور پڑتا تھا۔ راستے میں ڈامر کی بہت سی لمبی لمبی پیچ دار

گلیاں ملتی تھیں جو مسٹر عارفی کو ان کے گھر سے لیتیں اور اپنے پیچ وخم میں گھماتی پھراتی ہوئی سڑک کے سب سے قریب والے بس اسٹاپ پر پہنچادیتی تھیں۔ اس طرح مسٹر عارفی کو اتنا وقت مل جاتا تھا کہ اسٹاپ پر ذرا ستا کر سانسیں بھی درست کرلیں اور ٹھیک وقت پر دفتر پہنچنے کا اطمینان بھی کرلیں۔ تب وہ آرام کے ساتھ اسٹاپ پر کھڑے ہوکر بس کی راہ دیکھنے لگتے تھے۔

اس صبح بھی جب مسٹر عارفی گلیوں اور نئے بنے ہوئے ہم وضع مکانوں کے سامنے سے گذرتے ہوئے سڑک پر آئے تو ان کے قدموں نے ہمیشہ کی طرح انھیں بس اسٹاپ پر پہنچادیا۔

اسٹاپ پر کوئی نہیں تھا۔ مسٹر عارفی پہلے آدمی تھے۔ سڑک کی بتیاں ابھی تک جل رہی تھیں۔

مسٹر عارفی اپنی مقررہ جگہ پر کھڑے ہوگئے۔ وہ ہاتھ میں اپنا بڑا سا کالا بیگ سنبھالے ہوئے تھے اور ان کی نگاہیں ڈامر کی سرمئی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ سڑک آگے بڑھتی ہوئی ایک اونچی خوبصورت بلڈنگ کا چکر لگا کر دور ہوتی چلی گئی تھی۔ مسٹر عارفی کی جیبی گھڑی کی ٹک ٹک اور سینے میں دل کے دھڑکنے کی صدا کے سوا جو ان کے کانوں میں ہلکی ہلکی آرہی تھی، کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ اپنے گردوپیش سے بے خبر تھے۔ ہرے بھرے درخت ہوں یا شاندار عمارتوں پر سنہرا رنگ پھیرتا ہوا حسین چمکیلا سورج، انھیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سڑک کے کنارے والی نہر کی سریلی آواز جو ان کے چاروں طرف گنگنا رہی تھی، ان کو نہیں سنائی دے رہی تھی۔ چہرے کو تھپکتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کی طرف ان کی ذرا بھی توجہ نہیں تھی۔ ان کو نظر نہیں آرہا تھا کہ درختوں کی پتیاں کس طرح سبز پرندوں کی مانند ہوا کے جھونکوں سے ہلتی ہوئی ٹہنیوں میں انکھیلیاں کررہی ہیں۔ یہاں تک کہ سڑک کے اس پار سنگتراش کی دکان میں سرخ گلابوں کا خوبصورت گل دان بھی ان کی نگاہوں کو اپنی طرف نہ کھینچ سکا۔ مسٹر عارفی سڑک کے ڈامر کی پختگی اور چکنائی کی دید میں محو تھے۔ اگر وہ سر اٹھاتے بھی تو ان کی نگاہ سامنے والی بلڈنگ کی آخری منزل سے اوپر نہ جاتی، اور صبح کا نیلگوں آسمان اور اس میں آزادی سے اڑتے اور فضا کو متحرک کرتے ہوئے پرندے ان کو نظر نہ آتے۔ ان کی نگاہیں ڈامر کی صاف ستھری پٹی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ بس کا انتظار کررہے تھے۔

بس سڑک کے موڑ پر نظر آئی تو مسٹر عارفی چونچال ہوگئے۔ وہ ایک قدم آگے نکل آئے اور

ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ انھوں نے بس کو تعریفی نظروں سے دیکھا:

''کیا بجلی چیز ہے! بے آواز، تیز رفتار، نہ گھڑ گھڑ، نہ کھڑ کھڑ، بالکل جیسے اڑن گھوڑا!''

مسٹر عارفی کا جی چاہنے لگا کہ جلد سے جلد بس کی سیٹ پر بیٹھ کر اونگھنا شروع کر دیں۔

''کیسی نرم نرم آرام دہ سیٹیں ہوتی ہیں! مشینی صنعت کا شاہکار!''

بس ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مسٹر عارفی اس کو دھیرے دھیرے قریب آتے دیکھ رہے تھے۔ دفتری یادداشتوں اور سرکاری خطوں سے بھرے ہوئے بیگ کو مضبوطی سے پکڑ کر وہ بس کے رکنے کا انتظار کرنے لگے۔

سنسان سڑک دن کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ بس کے انجن کی ہلکی ہلکی گھر گھراہٹ ان کے نزدیک آتی جا رہی تھی۔

نرم ہوا نے مسٹر عارفی کے چہرے کو سہلایا، آس پاس کے درختوں پر سوئے ہوئے پرندوں نے جاگ کر پر پھڑ پھڑائے، نہر کا مدھم شیریں نغمہ ان کے کانوں کو چھونے بڑھا، اُس پار سنگتراش کے گلدان میں سرخ گلاب نے ان کی طرف شعلے کی طرح زبان لپکائی، ان کے سر پر ایک پرندہ زور زور سے چہچہانے لگا۔

اچانک مسٹر عارفی اچھل پڑے۔ ان کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ بوکھلا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔ بس قبل تاریخ کے کسی حیوان کی طرح سیدھی ان کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اگر وہ بھاگ کر نہر کے اُدھر والے فٹ پاتھ پر نہ چڑھ گئے ہوتے تو بس نے انھیں روند ہی ڈالا تھا۔

مسٹر عارفی نے نہر کے کنارے فٹ پاتھ پر سے بس کو دیکھا کہ اسٹاپ کے اندر گھستی چلی جا رہی ہے۔ اس کے زبردست آہنی پیکر سے پورا اسٹاپ بھر گیا تھا۔

مسٹر عارفی کے دیکھتے دیکھتے بس نے بڑے آرام سے نہر کو پار کیا اور فٹ پاتھ کا رخ کر کے ان کی طرف بڑھی۔ مسٹر عارفی پھر کئی قدم پیچھے ہٹے، اور بس کی طرف گھونسا تان کر بڑے غصے سے چیخے:

''ابے گدھے! کہاں چڑھائے دے رہا ہے؟''

لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ بس اب بھی انھیں کی طرف چلی آ رہی ہے تو وہ فٹ پاتھ

پر بھاگ کھڑے ہوے۔ کچھ دیر کے بعد رکے اور مڑ کر دیکھنے لگے۔ بس گھوم کر فٹ پاتھ پر آ گئی تھی اور اس کا رخ پھر ان کی طرف ہو گیا تھا۔ اس وقت ان پر انکشاف ہوا کہ بس کے اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ بغیر ڈرائیور اور بغیر کنڈکٹر کے وہ ان کی سمت چلی آ رہی تھی اور اس کے انجن کی گھر گھراہٹ تیز ہو گئی تھی۔

مسٹر عارفی مڑ کر بھاگے۔ ڈامر کا فٹ پاتھ بالکل ہموار تھا۔ مسٹر عارفی سرپٹ دوڑ رہے تھے اور ان کے قدموں کی آواز فٹ پاتھ پر گونج رہی تھی۔ ان کے بڑے سے سیاہ بیگ کا کھٹکا کھل گیا تھا اور اب وہ ان کے پیروں سے ملا ملایوں جھولتا جا رہا تھا کہ ہر پینگ کے ساتھ مسٹر عارفی کا ہاتھ آگے پیچھے جھٹکے کھا رہا تھا۔

کوئی سو قدم کی دوڑ لگانے کے بعد مسٹر عارفی رکے، پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ بس اسی طرح ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ مسٹر عارفی جلدی سے مڑے اور پھر بھاگ کھڑے ہوے۔

وہ جتنا بھی تیز دوڑتے، بس کے انجن کی گھر گھراہٹ انھیں اپنے پیچھے ہی سنائی دیتی۔ وہ جب بھی مڑ کر دیکھتے، اس کا بڑا سا عفریتی ہیولا ان کو اپنے سر پر منڈلاتا دکھائی دیتا۔ مسٹر عارفی زقند بھرتے اور پہلے سے بھی زیادہ تیز بھاگنے لگتے۔

دھوپ ان کے قدموں میں بجھتی جا رہی تھی۔ اس کی خوشگوار گرمی سے ان کو اتنی طاقت اور حرارت مل گئی تھی کہ اور بھی تیز دوڑ کر بس سے کچھ اور دور ہو جائیں۔ ایک سڑک طے کرنے کے بعد ان کی سانس پھولنے لگی۔ انھیں ایک تنگ سی گلی نظر آئی اور وہ لپک کر اس میں مڑ گئے۔ گھر گھراہٹ کی آواز ان کی پشت پر اسی طرح موجود تھی۔

وہ گلی میں تھوڑی ہی دور تک بھاگے ہوں گے کہ ان کا دم ٹوٹ گیا اور وہ رک گئے۔ گرمی کے مارے وہ پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ انھوں نے جیب سے رومال نکال کر چہرہ پونچھا۔ رومال تہہ کیا اور واپس جیب میں رکھ لیا۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور اطمینان کی سانس لی۔ جھکے اور اپنے دکھتے ہوے پیروں کو دبانے لگے۔ وہ ایک دیوار کے موکھے میں بیٹھ گئے، تھکا ہوا بدن دیوار سے ٹکا لیا۔ بیگ دیوار سے لگا کر رکھ دیا۔ پاؤں پھیلائے اور ان کا منھ کھلا:

''اوف فف...''

گھر گھراہٹ کی آواز سن کر وہ اچک پڑے۔ بس گلی کے اندر گھسی چلی آرہی تھی۔ مسٹر عارفی نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، دیوار کے پاس سے بیگ اٹھایا اور پھر بھاگنے لگے۔

ان کی راہ میں جدید ساخت کے ہم وضع مکان اور پکے راستے پڑ رہے تھے جنھیں تعمیر کے تازہ ترین اصولوں کے مطابق تیار کیا گیا تھا۔

مسٹر عارفی گلیوں سے ہوتے اور مکانوں کے سامنے سے گذرتے اڑے چلے جارہے تھے اور بس ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ مکانوں کی اونچی دیواروں نے دھوپ کو گلیوں میں اترنے سے روک دیا تھا اور گلیوں میں ان کا دائمی سایہ پھیلا ہوا تھا۔ خوبصورت ستھرے مکانوں کے سامنے دوڑتے دوڑتے اور سایہ دار گلیوں میں داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے مڑتے مڑتے مسٹر عارفی کا سر گھومنے لگا تھا اور بس اسی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلتی نظر آرہی تھی۔

راستے میں ہر طرف گلیاں تھیں اور مکان، ہر طرف نئی نئی سر بہ فلک عمارتیں تھیں۔ دوڑتے ہی میں ان کو کھڑکیوں کے شیشوں کے پیچھے عورت مرد دکھائی دے رہے تھے جو مکانوں کی صفائی ستھرائی اور جھاڑ پونچھ میں لگے ہوئے تھے۔ ویکیوم کلینر اور واٹر پمپ کی آوازیں بلند تھیں۔ مرد عورت لپک جھپک کر اِدھر اُدھر آجا رہے تھے اور اپنے اپنے کام میں منہمک تھے اور کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ ان کے جذبات سے عاری چہرے شیشوں کے پیچھے بار بار ظاہر اور غائب ہو رہے تھے۔

مسٹر عارفی نے ان کو آوازیں دیں، مدد کے لیے پکارا اور ہاتھ ہلا ہلا کر ان کو متوجہ کرنا چاہا، لیکن کھڑکیوں کے دبیز شیشوں اور پتھریلی دیواروں اور کلینر اور پمپ کے شور نے ان کی فریاد کو بے اثر کر دیا۔ لوگ گھروں کے اندر اپنے اپنے کاموں میں ایسے لگے ہوئے تھے کہ انھیں کسی اور بات کی خبر نہ تھی۔ کسی نے سر تک نہیں اٹھایا کہ مسٹر عارفی کو دیکھے اور بس کی آواز سنے۔ مسٹر عارفی ان کو، ان کی سرگرمیوں کو، ان کی آمد و رفت کو دیکھ سکتے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی مسٹر عارفی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ مسٹر عارفی کی نگاہوں کے سامنے گویا سینما کے پردے پر ایک فلم چل رہی تھی اور لوگ شیشوں کے پیچھے متحرک تصویروں کی طرح آجا رہے تھے اور اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔

بس نالوں نہروں کو عبور کرتی، درختوں مکانوں سے کتراتی، گلیوں کے پیچ وخم سے نکلتی مسٹر عارفی کے پیچھے پیچھے چلی آرہی تھی۔ حواس باختہ مسٹر عارفی جب بھی گھوم کر دیکھتے، بس کو اپنے پیچھے پاتے۔ جس راہ بھی مڑتے اور جس طرف بھی بھاگتے، بس انھیں پیچھے ہی دکھائی دیتی۔

مسٹر عارفی اچانک پلٹ پڑے۔ انھوں نے زمین پر سے اینٹ کا ٹکڑا اٹھا کر بس پر کھینچ مارا اور تہدیدی انداز میں اس کی طرف ہاتھ لہرانے لگے۔ ایک بار وہ ہانپتے ہوئے بیچ سڑک پر کھڑے ہو گئے اور رونے چلّانے لگے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ بس ان کی تمام دھمکیوں، احتجاجوں اور فریادوں سے بے نیاز اسی طرح ان کی طرف چلی آرہی ہے اور قریب ہے کہ ان کو کسی دیوار سے مسل دے، تو وہ پھر مڑے اور بھاگنے لگے۔

ہانپتے کانپتے ایک پوری سڑک طے کر کے وہ خوشنما مکانوں اور پکی سڑکوں کے پچھواڑے ایک کھلے ہوئے احاطے میں جا نکلے۔ ہر طرف عمارتی کھمبے اٹھے ہوئے تھے۔ باربردار مشینیں ایک کے پیچھے ایک آتیں اور مسالا ڈھیر کر کے چلی جاتیں۔ ہر طرف بجری، کنکریٹ، بالو، راکھی، چونے کے بڑے بڑے ڈھیر نظر آرہے تھے۔

مسٹر عارفی کی ناک میں مٹی کی سوندھی خوشبو آئی اور ان کو اپنے بچپن کے دن یاد آگئے جب وہ دوسرے بچوں کے ساتھ مٹی کے انباروں پر چڑھتے اور خوشی سے چیختے اور گرد اڑاتے ہوئے اوپر سے نیچے پھسلتے تھے۔

انھیں اپنی پشت پر بس کی گھر گھراہٹ سنائی دی اور وہ بدحواس ہو کر آگے کو دوڑے اور کنکریٹ کے ایک انبار پر چڑھتے چلے گئے۔

چاروں ہاتھ پیروں سے وہ کنکریٹ کے انبار پر چڑھ رہے تھے اور ہانپ رہے تھے۔ بڑے سے بیگ کو وہ اپنے پیچھے پیچھے کنکریٹ پر گھسیٹ رہے تھے۔ کنکریٹ کے ریزے ان کے پیروں سے ہل ہل کر کھر کھر کرتے نیچے لڑھک رہے تھے۔

وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے انبار کی چوٹی تک لے گئے۔ اب وہ تھک کر چور ہو چکے تھے۔ ان کی آنکھوں نے دیکھا کہ کنکریٹ کے انباروں کے اُس طرف ایک سبز میدان دور تک چلا گیا ہے اور سارے میں حسین سنہری دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ جا بہ جا پرانے ہرے بھرے درختوں کے

خوبصورت باغ لگے ہوئے ہیں۔ دور سے چڑیوں کی چہکار اور بہتے پانی کی آواز آرہی ہے۔ مسٹر عارفی بے اختیار اس میدان کی طرف لپکے۔ لیکن چند قدم بھی نہ بڑھے ہوں گے کہ تھکن سے ان کے گھٹنے جواب دے گئے۔ وہ کنکریٹ کے انبار پر لڑھکنے لگے اور بے ہوش ہو گئے۔

مسٹر عارفی کو ہوش آیا تو ان پر بس کی بڑی سی سیاہ پرچھائیں پڑ رہی تھی اور اس کے انجن کی آواز ان کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

انھوں نے بس کو دیکھا کہ ان کے پاس ہی کھڑی ہے اور نزدیک سے دیکھنے پر اور بھی خوبصورت نظر آرہی ہے۔ اس کی چوڑی چکلی باڈی کو دیکھ کر رعب پڑتا تھا۔ اس کے انجن کی ہلکی ہموار گھر گھراہٹ فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

مسٹر عارفی کی تعریفی نظریں بس پر جم گئیں اور ان کے ہونٹ ہلے:

''کیا ڈیزائن ہے، کتنی حسین! صنعت کا شاہکار...!''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور بس کے بڑے سے خوش وضع پہیے اور اس کی چمچماتی ہوئی پلیٹ پر ہاتھ پھیرنے اور انگلیاں دوڑانے لگے۔ بمپر پر ہاتھ ٹیک کر وہ کھڑے ہوئے اور بس کی چمک دار باڈی میں اپنا عکس دیکھ کر ہنس پڑے۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر انھوں نے ٹائی کی گرہ درست کی اور اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ کپڑے جھاڑے اور بس کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

بڑا سا وزنی بیگ ہاتھ میں لٹکائے اور اپنی جیبی گھڑی کی ٹک ٹک سنتے ہوئے وہ بس پر چڑھے اور کھڑکی کے پاس کی آرام دہ گدے دار سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ان کو اپنا سارا بدن دکھتا محسوس ہو رہا تھا۔

بس چل دی۔ مسٹر عارفی نے کھڑکی کے شیشے میں سے آخری بار دھوپ میں چمکتے ہوئے سبزہ زار اور پرانے ہرے بھرے باغوں کا منظر دیکھا۔ چڑیوں کی چہکار اور پانی کی گنگناہٹ سنی۔ پھر انھوں نے سیٹ کی نرم پشت سے ٹیک لگالی اور آنکھیں بند کر لیں۔

بس نے کنکریٹ کے انباروں کا چکر لگایا اور جدید وضع کے صاف ستھرے مکانوں اور ڈامر کی سڑکوں کی طرف بڑھنے لگی۔

گھروں سے اٹھتے ہوئے دھویں کی لکیروں نے شہر پر ایک کالا بادل تان دیا تھا۔

اس کالے بادل کے نیچے تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی بس شہر کے چھوٹے چھوٹے ہم وضع مکانوں کی اولین قطاروں کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔ اس کے پیچھے پانی کی آواز اور چڑیوں کی چہکار مدھم پڑتی جارہی تھی۔

❄❄

(فارسی عنوان: ''آن سوی تل ہائی شن'')

جمال میر صادقی

ہوا کی ہوک

وہ بڈھا کھڑا ہوا تھا اور دہری سڑک کے اس پار گھورے جا رہا تھا۔ اُس پار، سڑک کی درمیانی نہر کے کنارے، ایک جوان عورت اور ایک تگڑا سا مرد کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ سڑک خالی تھی، البتہ کبھی کبھی کوئی موٹر کار آ کر تیزی سے نکل جاتی تھی۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ چنار کے درختوں کو جھنجھوڑیاں دیتی ہوئی تند ہوا سے سڑک کی خاک اڑ اڑ کر فضا میں پھیل رہی تھی۔

بڈھے کے رعشہ دار ہاتھ میں ہلتی ہوئی لاٹھی ڈامر کے فٹ پاتھ پر کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور منھ سے بے معنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں سڑک کی دوسری سمت سے ہٹائے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ تگڑا آدمی نحیف بدن کی مختصر سی عورت کے سامنے جھکا ہوا ہاتھ نچا نچا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ عورت کے لمبے سیاہ بال ہوا سے اڑ رہے تھے اور اس کے لپے پتے چہرے پر سڑک کی دھول جم رہی تھی۔

ان دونوں سے کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے سرخ رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ اسٹیرنگ کے پیچھے ایک آدمی بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور ان پر نظریں گاڑے ہوے تھا۔

بڈھا لاٹھی ٹیکتا ہوا نہر کی سمت بڑھا۔ نہر مٹ میلے پانی سے لبالب بھری ہوئی تھی اور غراتی ہوئی سڑک کی ڈھال کے رخ بہہ رہی تھی۔ بڈھا اُدھر سے پلٹا اور سڑک کے پل کے پاس پہنچا، تیزی کے ساتھ پل کو پار کر کے دوسری طرف اترا اور اسی تیزی سے ادھر کی سڑک بھی پار کرنا چاہتا تھا کہ ہارن کی طویل چیخ نے اس کے قدم روک دیے۔ ایک کار اس کے قریب سے ہو کر زن سے نکل گئی۔

لاٹھی ٹیکتے ہوے بڈھے نے سڑک کی چوڑان پار کی اور جلدی سے خود کو نہر والے کنارے

پر پہنچا دیا۔ تگڑے آدمی نے عورت کی بانہہ پکڑلی تھی اور اس کو آہستہ آہستہ سرخ کار کی طرف لیے جا رہا تھا۔

بڈھا پیچھے سے ان کے سر پر آ پہنچا۔ اس نے لاٹھی اٹھا کر ایک جما ہوا ہاتھ مارا۔ لاٹھی تگڑے آدمی کے سر کے پاس سے ہوتی ہوئی اس کے بائیں بازو پر پڑی۔ وہ اچھل کر پلٹا اور تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ بڈھے کی لاٹھی پھر اٹھی لیکن اس کا نشانہ چوک گیا۔ تگڑے آدمی کی حیرت زدہ آواز بلند ہوئی:

"!!!!!"

اس نے بڈھے کی لاٹھی کو، جو پھر بلند ہوگئی تھی، بیچ ہی میں پکڑلیا، بڈھے کی سرخ انگارہ آنکھوں کو دیکھا، لپک کر عورت کو پیچھے کھینچا اور بولا:

"کھڑی رہو، پاگل ہے۔"

اس نے بڈھے کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کی طرف مروڑ دیا۔ بڈھا تکلیف سے کراہنے لگا۔ عورت ان کی طرف لپکی اور چیخی:

"چھوڑو! چھوڑو!"

مرد پلٹا اور بھونچکا سا ہو کر عورت کو دیکھنے لگا۔ پھر بولا:

"میں کیا کر رہا ہوں! یہ خرافاتی خود ہی بھڑا ہوا ہے۔"

اس نے بڈھے کو چھوڑ دیا۔ لاٹھی زمین پر گر گئی۔ بڈھا گالیاں بکتا ہوا پھر اس پر جھپٹا۔ آدمی نے تاؤ کھا کر اس کے منھ پر ایک ہاتھ رسید کیا اور لاتیں مار مار کر اسے پیچھے کھدیڑنے لگا۔ بڈھا الٹے پاؤں ہٹتا گیا، یہاں تک کہ اس کے پیر نہر کی پکی منڈیر سے ٹکرائے اور وہ چاروں شانے چت پانی میں جا پڑا۔

اسٹیرنگ کے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی نے کھڑکی سے سر باہر نکالا اور پکار کر پوچھا:

"کیا بات ہے، عبدول؟ یہ بڈھا کہاں سے آمرا؟"

تگڑا آدمی برا سا منھ بنائے ہوئے مڑا اور بولا:

"قسم سے، مجھے نہیں پتا۔ کمبخت نے میرا ہاتھ . . ."

وہ اپنا بازو سہلانے لگا۔ اسٹیرنگ والے نے پھر پکار کر پوچھا:

''پاگل واگل ہے کیا؟''

عورت بڈھے کی طرف دوڑی جو نہر میں پڑا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بڈھے کے چہرے پر خون تھا اور سر اور منھ سے پانی کی دھاریں گر رہی تھیں۔

ہوا درختوں کو کبھی جھکاتی، کبھی سیدھا کرتی، آس پاس کے مکانوں کی دو چھتیوں میں ہوکتی پھر رہی تھی۔ چنار کے سوکھے پتے اڑ رہے تھے اور درختوں کی سنسناہٹ سے فضا گونج رہی تھی۔

فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ایک راہگیر ٹھٹک کر رک گیا اور پوچھنے لگا:

''کیا معاملہ ہے؟''

تگڑے آدمی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ دھمکانے کے انداز میں راہگیر کی طرف ہاتھ لہرا کر بولا:

''جاؤ جاؤ، اپنا کام کرو جی۔''

اسٹیرنگ والے نے پھر پکار کر کہا:

''اسے چھوڑو بابا۔ چلو نا، کہاں اٹک گئے؟''

بڈھا اب نہر کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سفید بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا، پورا بدن کیچڑ میں لت پت ہوگیا تھا اور نتھنوں سے خون نکل رہا تھا۔ عورت اس کے پہلو میں زمین پر بیٹھ گئی تھی اور رومال سے اس کے چہرے کا خون پونچھ رہی تھی۔ اس کا اپنا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

تگڑے آدمی نے جھک کر عورت کا ہاتھ پکڑا اور اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ عورت نے غضب ناک ہوکر خود کو چھڑا لیا اور چیخی:

''چھوڑ مجھ کو، قرّم ساق!''

آدمی اس کا بازو چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں اسٹیرنگ والے کی طرف مڑ کر دیکھا اور بے بسی کے ساتھ شانے اُچکائے۔ اس کے چہرے اور بدن کی ایک ایک جنبش سے ظاہر تھا کہ وہ بری طرح سٹپٹایا ہوا ہے۔

اچانک بڈھا اچھل کر کھڑا ہو گیا اور عورت پر گھونسے اور لاتیں چلانے لگا۔ عورت نے گردن جھکا رکھی تھی اور خود کو بڈھے کے حملوں کے حوالے کر دیا تھا۔

نہر کے اس طرف والے فٹ پاتھ پر دو آدمی اور ایک بچہ چپ چاپ کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ بڈھا عورت پر پلا پڑا تھا اور دونوں مٹھیوں میں اس کے بال جکڑے ہوئے اپنے گھٹنوں اور ایڑیوں سے اس کو کوٹے ڈال رہا تھا۔ عورت اسی طرح گھٹنوں میں سر دیے زمین پکڑے بیٹھی تھی اور ذرا بھی مدافعت نہیں کر رہی تھی۔ ہوا اسی طرح سڑک پر ہوک رہی تھی اور درختوں کے شور سے اسی طرح ہر طرف ہنگامہ برپا تھا۔

اسٹیرنگ والا کار کو بڑھا کر قریب لایا اور اس پر سے کود کر نیچے اترا۔ اس نے طیش میں آ کر بڈھے کو پیچھے ڈھکیل دیا اور عورت کو گھسیٹ کر اس کے پنجے سے چھڑایا۔ وہ بے ہوش سی ہو کر سڑک پر ڈھیر ہو گئی۔

تگڑا آدمی آگے بڑھا۔ دونوں نے مل کر عورت کو زمین پر سے اٹھایا اور گاڑی کی طرف لے چلے۔

بڈھا ان کے پیچھے لپکا۔ آدمی نے پلٹ کر اسے ایک اور دھکا دیا۔ بڈھا الٹ کر سڑک پر گر گیا۔ تگڑے آدمی نے عورت کو گود میں اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈال دیا اور خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔

بڈھا لنگڑاتا اور شور مچاتا ہوا گاڑی کے پیچھے دوڑا، لیکن گاڑی روانہ ہو چکی تھی۔ اسٹیرنگ والے نے گاڑی کے عقبی آئینے میں اس کو دیکھا اور بولا:

''باندھ کر رکھنے والا ہے، پاگل۔''

اس نے گاڑی کی رفتار بڑھائی، پھر بولا:

''ہم نہ پہنچ گئے ہوتے تو بچی کو مار ہی ڈالا تھا۔''

اس کی پشت پر عورت کی سسکیوں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

❀❀

(فارسی عنوان: ''زوزۂ باد'')

شین پرتو

بہائے عشق

سورنا کا بیٹا ہیرتا دریائے زر-ٹمند کے کنارے اپنی آبائی جاگیر پر ایک وسیع اور پرشکوہ محل میں رہتا تھا۔ ہیرتا سورنا کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور سورنا اشکانی بادشاہ اردکا وہ زبردست سپہ سالار تھا جس نے بین النہرین کے علاقے میں رومیوں کو شکست فاش دی تھی۔ اسی جنگ میں رومی سردار کراسوس مارا گیا تھا۔

ایران پر ساسانیوں کی حکومت ہوجانے سے اشکانیوں کا اقتدار ختم ہوگیا۔ بڑے بڑے ایرانی سردار ساسانی بادشاہ اور دشیر بابکان کے حلقے میں شامل ہوگئے۔ بچے کھچے اشکانیوں میں سے جنھوں نے ساسانیوں کے مقابلے میں سرکشی نہیں کی تھی وہ اپنے اپنے علاقوں میں خاموشی کے ساتھ زندگی گذارنے لگے۔ سورنا کا بیٹا ہیرتا بھی اپنے باپ کے گرمائی محل میں خاموشی کے ساتھ زندگی گذار رہا تھا۔ چند سال ہوئے اس کی پہلی بیوی کی وفات ہوگئی تھی اور چونکہ اس بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اس لیے گذشتہ سال ہیرتا نے ایک اکیس سالہ دوشیزہ سے شادی کر لی تھی۔ اس دوشیزہ سے ہیرتا کی ملاقات اتفاقاً ایک گاؤں میں ہوگئی تھی۔ ایک دن شکار پر سے واپس ہوتے ہوئے گاؤں کے پاس اس نے ماندا کو دیکھا جو پانی کا گھڑا کندھے پر رکھے چشمے سے گھر واپس جارہی تھی۔ ہیرتا نے اس سے پانی مانگا، اس کا نام پوچھا، اسی رات اس کے بوڑھے باپ سے اس کے لیے پیغام دیا اور دو دن بعد ماندا کو اپنے محل میں لے آیا۔

ماندا حسین، سروقد اور پرکشش جسم کی لڑکی تھی۔ اپنی سیاہ وحشی آنکھوں، لمبی زلفوں، سفید نرم جلد اور متناسب اعضا کے ساتھ بڑی بڑی آرزوئیں لیے ہوئے وہ ہیرتا کے محل میں وارد ہوئی۔ لیکن ہیرتا کا زیادہ وقت اپنی دور افتادہ املاک کی دیکھ بھال اور شکار میں گذرتا تھا۔ اسے

حسن وشباب سے بھرپور ماندا کی دلجوئی کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ شروع کے چند ہفتے ماندا پر برے نہیں گذرے لیکن چند ماہ بعد اس کی زندگی جہنم ہوگئی اور اس کو ہیرتا کا عظیم الشان محل قید خانہ معلوم ہونے لگا۔ پھر ہیرتا جوان بھی نہ تھا۔ وہ ماندا سے دگنی عمر کا تھا۔

ایک جوان اور پُرارمان لڑکی کی زندگی اپنے سے کہیں زیادہ عمر والے مرد کے ساتھ کیسی گذر سکتی ہے؟ ماندا کا دل عشق اور شباب کے جنون آمیز نغموں کے لیے تڑپ رہا تھا اور ہیرتا اپنی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے اس کی شوریدہ روح کو تسکین نہیں دے پاتا تھا۔

اس لیے ماندا افسردہ رہتی تھی اور اس تروتازہ گلاب کی طرح جو اچانک دہکتے ہوئے سورج کے نیچے آجائے، مرجھاتی چلی جارہی تھی۔

ہیرتا کی نظروں سے اپنی جوان بیوی کی حالت پوشیدہ نہ تھی۔ وہ بخوبی سمجھتا تھا کہ اگر بروقت کوئی تدبیر نہ کی گئی تو اسے ماندا سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ وہ ماندا کو چاہتا بھی بہت تھا اور اسے اپنے بہترین مال اور گراں ترین جواہرات کی طرح عزیز رکھتا تھا۔

آج بھی دن کے کھانے پر حسب سابق ماندا کی بھوک غائب تھی۔ اس نے شراب کا جام اٹھایا، ہونٹوں سے لگایا اور پیے بغیر واپس رکھ دیا۔ اس نے افسردہ اور رحم طلب نظروں سے لمحہ بھر ہیرتا کو دیکھا اور سر جھکالیا۔

ہیرتا نے گھٹی ہوئی مضطرب آواز میں کہا:

''ماندا! میں جانتا ہوں کہ تم بہت پریشان رہتی ہو۔ لیکن کیا کروں؟ ایسے الجھاووں میں گرفتار ہوں کہ تمھاری خاطر داری نہیں کر پاتا۔ بہرحال، اب میں نے تمھارے دل بہلاوے کی ایک صورت نکال لی ہے۔''

اگرچہ اس بات میں ماندا کی دلچسپی کا کافی سامان تھا لیکن اس نے دوبارہ سر اٹھا کر اپنے شوہر کو نہیں دیکھا۔ ہیرتا نے پھر کہا:

''سنو ماندا! آج ایک جوان ہمارے محل میں آئے گا۔ وہ بہت اچھا شہسوار ہے۔ تیراندازی اور چوگان میں بھی مہارت رکھتا ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ ہمارے یہاں قیام کرے اور تم کو شہسواری اور چوگان بازی سکھائے۔ اس کو بہت سے ہنر آتے ہیں۔ میں نے

اسے فارس سے بلوایا ہے۔ وہ بالکل اپنوں کی طرح دن رات ہمارے ساتھ رہے گا، ہمارے ساتھ ہی گھومے پھرے گا اور ہمارے ساتھ ہی کھانا بھی کھایا کرے گا۔''

ماندا کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ ''شہسواری''، ''چوگان بازی''، ''دن رات ہمارے ساتھ رہے گا''، یہ الفاظ اس کے کانوں میں کسی گھنٹے کی آواز کی طرح گونج رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی بد بخت زندگی کے اندھیرے میں ایک نئی روشنی داخل ہو رہی ہے۔

اسی دن سہ پہر کو جب ہیرتا اور ماندا محل کے ایک بڑے اور شاداب چمن میں سیر کر رہے تھے، ایک نوکر نے آ کر اطلاع دی کہ جس مہمان کا انتظار تھا وہ آ گیا ہے۔

مہیار، چھریرے بدن کا تیس سالہ جوان، گھنے بال، چاق چوبند، نئے دولھا کی طرح خوش وخرم ان کے سامنے کھڑا ہنس رہا تھا۔ ایک چھوٹا خنجر اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا اور اس کی نگاہوں میں ایک کوندتی ہوئی بجلی تھی جو سیدھی دل میں اتر جاتی تھی۔

مہیار کو دیکھ کر ماندا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ اس کے آنے سے دل ہی دل میں بے حد خوش تھی۔ کبھی کبھی کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ بھی لیتی اور اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ مہیار اپنے سفر کا حال اور راستے کی تکلیفیں بیان کر رہا تھا۔ اس نے ہیرتا کے محل کی سیر کے بعد اس کی تعریف کرتے ہوئے ہیرتا سے کہا:

''میرے آقا، آپ کا محل اور باغ نہایت شاندار اور خوبصورت ہے۔ اکباتان کے باغوں میں واقعی بڑے دلفریب اور حسین پھول پیدا ہوتے ہیں؛'' اور یہ کہتے کہتے یکبارگی اس نے پلٹ کر ماندا پر نظریں جما دیں اور کہا:

''لیکن بانوے من! فارس میں بھی مہکتے ہوئے جاں فزا گلابوں کی کمی نہیں ہے۔''

ہیرتا کے محل میں قیام کے ساتھ ہی مہیار نے ماندا کے دل میں بھی گھر کر لیا تھا۔ ماندا بالکل بدل گئی تھی۔ وہ ایسے بچے کی طرح جسے کوئی دلچسپ اور انوکھا کھلونا دلا دیا جائے، ہر وقت خوشی سے چہکتی رہتی تھی۔ مہیار بھی بہت خوش تھا۔ وہ روز گھنٹے دو گھنٹے ماندا کے ساتھ گھوڑے پر سواری کرتا اور اس کو چوگان کھیلنا سکھاتا۔ آہستہ آہستہ وہ ماندا کی طرف کھنچنے لگا اور جب بھی موقع پاتا،

اپنی نگاہوں اور حرکات وسکنات سے ماندا پر اپنا عشق ظاہر کرتا۔ جب وہ دنوں ساتھ ساتھ سیر کو نکلتے تو وہ کسی نہ کسی بہانے ماندا کی گردن یا بازوؤں یا ہاتھوں سے اپنے ہونٹ لگا دیتا، یا اس کی سیاہ مہکتی زلفوں میں اپنا چہرہ چھپالیتا۔ آخر کار ایک دن سرخ گلاب کی ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے ماندا اور مہیار کی باہیں ایک دوسرے کے گلے میں حمائل ہوگئیں اور ان کے ہونٹ بے اختیار آپس میں پیوست ہو گئے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ایک دن جب ہیرتا صبح کی گشت سے واپس آیا تو اس نے کپڑے بدلتے بدلتے ماندا سے پوچھا:

''ماندا عزیزم! کہو مہیار سے خوش ہو؟''

''بہت خوش ہوں،'' ماندا نے جواب دیا۔''اس نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ اب میں گھوڑے پر بیٹھ کر بڑی سے بڑی نہر پار کرسکتی ہوں۔ چوگان میں بھی میں نے کافی ترقی کی ہے۔ لیکن ابھی اور مشق بڑھانا ہے۔''

''تمھارا کیا خیال ہے،'' ہیرتا نے پوچھا،'' کتنے دن میں چوگان اچھی طرح سیکھ جاؤ گی؟''

''معلوم نہیں، وہ تو یہی کہتا ہے کہ میری صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے امید ہے کہ چار مہینے کے اندر میں چوگان بازی میں ماہر ہو جاؤں گی اور اس کے سارے داؤں پیچ سیکھ جاؤں گی۔ لیکن مہیار کو جلدی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا چاہیے۔''

ہیرتا بولا:

''ٹھیک تو کہتا ہے، بہتر یہی ہے کہ ہر چیز دھیرے دھیرے سیکھو۔''

پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ہیرتا نے اچانک پوچھا:

''اچھا ماندا، سچ سچ بتاؤ، تم مہیار کو کتنا پسند کرتی ہو؟ اسے زیادہ چاہتی ہو یا مجھے؟''

یکلخت ماندا کا دل بیٹھنے لگا، لیکن اس نے خود کو سنبھال کر کہا:

''ہیرتا! ہیرتا! تم تو میرے شوہر، میرے آقا ہو۔ وہ فقط ایک شہسوار ہے۔''

ہیرتا ماندا کے قریب آ گیا۔ اس نے ماندا کے ہاتھ پکڑ لیے اور انھیں سہلانے اور چومنے لگا۔ پھر بولا:

''ماندا! میں تم کو اجازت دیتا ہوں کہ اس کے ساتھ ہنسی خوشی دن گذارو، سیر و تفریح کرو... لیکن مجھے یقین ہے کہ تم خود پر قابو رکھو گی اور کوئی ایسا کام نہ کرو گی جو میری شرافت کے برخلاف ہو۔''

اس دن کے بعد سے ماندا کو مہیار کے ساتھ مگن رہنے کی اور بھی چھوٹ مل گئی۔ اب وہ اس کو پہلے سے زیادہ پیار دیتی، پہلے سے زیادہ پیار کرتی۔ جب بھی وہ دور دراز کے باغوں اور سبزہ زاروں میں سیر کرنے جاتے تو وہ نرم گھاس پر مہیار کے ساتھ لوٹنے لگتی۔ لیکن جب بھی مہیار دست درازی کرنا چاہتا تو ماندا اس سے دور ہٹ جاتی۔ مہیار کے ساتھ گذرنے والے لمحات کتنے حسین تھے! لیکن وہ کوئی ایسی بات نہ ہونے دیتی جس سے ہیرتا کی عزت پر حرف آتا ہو۔ مگر مہیار ماندا کے عشق میں پاگل ہو رہا تھا اور وصال کے لیے بے تاب تھا۔ آخر ایک دن اس نے ماندا سے کہا:

''ماندا! ماندا، شیریں من! آخر تم میری کب ہوگی؟ کیوں اپنے محبوب کو پھونکے ڈال رہی ہو۔ کیا تمھیں مجھ سے محبت نہیں؟''

ماندا نے جواب دیا:

''کیوں نہیں مہیار! کیوں نہیں۔ مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔ مگر تم نہیں جانتے میری راہ میں کتنی مشکلیں ہیں۔ ابھی میں خود کو تمھارے حوالے نہیں کر سکتی، لیکن میرا دل تمھارا ہے۔ میری روح، میرے احساسات تمھارے ہیں۔''

مہیار نے ایک آہ بھر کر پوچھا:

''پھر کب؟ ماندا مجھے اتنا نہ ستاؤ۔ ہمارے سے محبت کرنے والوں کے لیے کوئی بات مشکل نہیں۔ اگر مشکلوں کے پہاڑ بھی ہوں تو پانی ہو سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں ساری مشکلوں کو راستے سے ہٹا سکتی ہوں۔ لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہ اس کی قیمت بہت زیادہ ہوگی۔''

مہیار اس کا چہرہ اپنے سینے میں چھپا کر بولا:

''جو قیمت بھی ہو، ماندا، جو قیمت بھی دینا پڑے۔ میں تمھیں حاصل کرنے کے لیے جان

تک دینے پر تیار ہوں۔"

ماندا کچھ دیر خاموش رہی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور پھر یوں جیسے خواب میں بول رہی ہو، اس نے کہا:

"یہی سہی، مہیار، یہی سہی۔ اب کی بار جب ہیرتا جاگیر پر جائے گا، میں تمھاری ہو جاؤں گی۔"

بارہ دن بعد ہیرتا اپنے ہمراہیوں سمیت جاگیر پر چلا گیا۔ اس دن مہیار اور ماندا بہت خوش تھے۔

دوپہر ہونے سے پہلے، چوگان کھیلنے کے بعد وہ دونوں گھوڑوں پر بیٹھ کر روانہ ہوئے اور پہاڑ کے اوپر واقع ایک پرسکون اور حسین سبزہ زار میں جا اترے۔ ماندا کی نظروں میں محبت، مہیار کی نگاہوں میں آگ تھی اور وہ مبہوت ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ ان کی نظروں میں کیا حسن تھا، کیا شعریت تھی! انھوں نے آپس میں کوئی گفتگو نہیں کی، لیکن ان کے ایک ایک بوسے اور ان کی ہر ہر ادا سے ان کے محسوسات کی بہترین ترجمانی ہو رہی تھی۔

وہ دیر تک اس گھاس پر لیٹے رہے۔

وہ دن اور اس کے بعد کا زمانہ نہایت دلکش تھا۔ ان کے لمحات کتنے حسین تھے۔ محبت کتنی شیریں، کتنی پُرمزہ ہوتی ہے!

ماندا نے مہیار کو سمجھا رکھا تھا کہ کھانے کے وقت جب سب یکجا ہوا کریں تو اپنی نگاہوں اور حرکات پر قابو رکھے اور ہیرتا کے دل میں ذرا بھی شک پیدا نہ ہونے دے۔

لیکن محبت کرنے والے لاکھ چھپائیں، دوسروں کی نظریں جو دیکھنا ہوتا ہے دیکھ ہی لیتی ہیں۔ اور جو شوہر اپنی بیویوں کو نظر میں رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ اور سب سے پہلے ان کی بےوفائی کو تاڑ جاتے ہیں۔ ہیرتا جاگیر پر سے واپس آنے کے تھوڑے ہی دن بعد سمجھ گیا تھا کہ ماندا پیمان توڑ چکی ہے۔ لیکن اس نے ماندا سے کچھ نہ کہا۔

آج رات جب ماندا دسترخوان پر پہنچی تو مہیار کی جگہ خالی تھی۔ سویرے وہ مہیار سے ملی تھی اور دوپہر کے بعد گھوڑے پر اس کے ساتھ سیر کو گئی تھی۔ اس نے ایک کنج میں مہیار کی آغوش

میں عشق کی لذت بھی حاصل کی تھی۔ لیکن سیر سے واپس آنے کے بعد مہیار گھوڑوں کو لے کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد سےماندا نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ محل ہی میں کہیں ہوگا۔

وہ مہیار کی خالی جگہ کو بار بار دیکھ رہی تھی اور پریشان ہو چلی تھی۔ آخر ہیرتا نے کہا:

''پریشان نہ ہو ماندا! میں نے اس کو قریب کے گاؤں میں بھیجا ہے کہ گھوڑے کا ایک سفید بچھڑا جو وہاں مجھ کو پیش کیا گیا تھا لے آئے۔ میرا خیال ہے وہ کل دوپہر تک واپس آجائے گا۔''

ماندا کھانے میں مشغول ہوگئی۔ اسے یاد آیا کہ وہ گھاس پر دیر تک مہیار کی آغوش میں سوتی رہی تھی۔ لذت کے اس احساس کو چھپانے کے لیے وہ شراب کا جام تہہ تک پی گئی۔ ہیرتا نے دوبارہ اس کے جام میں شراب بھر دی۔ خدمتگاروں نے کھانا لاکر ان کے سامنے لگا دیا۔

شراب نے ماندا کی بھوک چمکا دی تھی۔ اس نے بڑی رغبت کے ساتھ کھاتے ہوئے اپنی پوری قاب خالی کر دی۔ اور کچھ دیر بعد جب وہ سیب کاٹ کر کھا رہی تھی، ہیرتا نے اس سے پوچھا:

''ماندا! کہو، کھانا مزے کا لگا؟''

ماندا نے جواب دیا:

''ہاں، بہت مزے کا تھا۔''

ہیرتا نے پوچھا:

''جانتی ہو یہ کھانا کس چیز سے تیار کیا گیا تھا؟''

''نہیں،'' ماندا نے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔''

تب ہیرتا نے بہت سکون کے ساتھ کہا:

''یہ اس کا جگر تھا... ماندا، تم نے ابھی مہیار کا جگر کھایا ہے۔''

سیب اور چاقو ماندا کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس کا سارا بدن سرد پڑ گیا۔ اچانک وہ ایک وحشت ناک چیخ مار کر کھڑی ہوگئی۔ وہ دیوانوں کی طرح بے تحاشا

چلاّئے جارہی تھی۔

وہ اٹھ کے بھاگی اور اس نے خود کو کھڑکی سے نیچے باغ میں گرادیا۔

❄❄

(فارسی عنوان: ''بہای عشق'')

صادق ہدایت

فرانسیسی قیدی

میرا قیام بیزانسن میں تھا۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ میرا ملازم ملگجا نیلا ایپرن باندھے جھاڑو لگا رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے میز پر سے ایک کتاب اٹھائی جو جنگ کے بارے میں تھی اور حال ہی میں جرمن سے ترجمہ ہوئی تھی۔ کہنے لگا:

''صاحب، آپ یہ کتاب مجھے پڑھنے کو دیں گے؟''

میں نے تعجب کے ساتھ پوچھا:

''یہ بھلا تمھارے کس کام کی؟ کوئی قصہ کہانی تھوڑی ہے۔''

اس نے جواب دیا:

مجھے پتا ہے صاحب، لیکن آخر میں بھی تو لڑائی پر گیا تھا۔ مجھ کو بشوں نے پکڑ لیا تھا۔''

فرانسیسی میں جرمنوں کو حقارت کے طور پر 'بش' کہتے ہیں۔ میں نے جرمن فوجیوں کی بدسلوکیوں کی بہت سی جھوٹ سچ داستانیں سن رکھی تھیں اس لیے مجھے کرید ہوئی۔ سوچا اس سے کچھ اگلوایا جائے، پھر سوچا کہ یہ بھی چھوٹتے ہی جرمنوں کو لاکھوں مغلظات سنا کر رکھ دے گا۔ مگر خیر، میں نے پوچھا:

''کیا واقعی بشوں نے تم لوگوں کے ساتھ بہت برا برتاؤ کیا تھا؟ ذرا اپنے قید ہونے کا حال سناؤ۔''

میری پرسش نے اس کے زخموں کو چھیڑ دیا اور اس نے مجھے اپنی داستان سنائی:

❄

''میں دو برس جرمنی میں قید رہا۔ مجھے فوج میں بھرتی ہوئے بہت دن نہیں ہوئے تھے کہ نینسی کے نزدیک جھڑپ ہوگئی۔ ہم کوئی تین سو آدمی رہے ہوں گے۔ جرمنوں نے ہمیں گھیر لیا اور لگے ہوائی فائر کرنے۔ ہم سے کچھ بنائے نہیں بنی۔ مقابلہ تو کر نہیں سکتے تھے، آخر سب نے بندوقیں پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ کچھ جرمن سپاہی بڑھ کر آگے آئے اور ان میں کا ایک فرانسیسی میں کہنے لگا:

''تم لوگ قسمت کے اچھے رہے کہ تمھارے لیے تو لڑائی ختم ہوگئی۔ ہمارا بھی بہت جی چاہتا ہے کہ تمھاری جگہ ہم ہوتے۔''

اس کے بعد انھوں نے ہماری تلاشی لے کر سارے ہتھیار رکھوا لیے اور ہمیں الگ الگ ٹولیوں میں پہرے داروں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ ہم میں کچھ زخمی بھی تھے۔ ان کو ہسپتال بھیجا گیا۔ دو دن کے سفر کے بعد مجھے اور ایک اور فرانسیسی قیدی کو بیمار روسی قیدیوں کے وارڈ میں سنتری بنا دیا گیا۔ لیکن یہ کام بڑا گھناؤنا تھا، بیمار لوگ زمین پر تھوکتے تھاکتے بہت تھے۔ مجھ سے وہاں زیادہ دن نہیں رہا گیا۔ میں نے کہا، مجھے کوئی اور کام دیا جائے، اور انھوں نے منظور بھی کرلیا۔ اب مجھے کولون کے پاس کے ایک گاؤں میں کھیتی باڑی پر لگایا گیا۔ میرا وہ ساتھی بھی وہیں بھیج دیا گیا۔ ہم روز صبح چھ بجے اٹھ کر گھڑسال میں کام کرتے۔ گھوڑوں پر کھریرا پھیرتے، پھر آلو کے کھیتوں میں لگ جاتے۔ ہمارا اصل کام کھیتی باڑی ہی کا تھا۔ وہیں میں نے اور میرے دوست نے بھاگنے کی سوچی۔ دو رات دو دن پیدل یہاں سے وہاں مارے مارے پھرتے رہے۔ سوچا تھا ہالینڈ ہوتے ہوئے فرانس نکل جائیں گے۔ زیادہ تر رات ہی رات چلتے تھے۔ بدقسمتی سے جرمن زبان بھی نہیں آتی تھی۔ میرے کان ٹھس تھے، سو میں تو کچھ لفظوں کے آگے جانتا ہی نہ تھا، البتہ میرے دوست کو مجھ سے اچھی آتی تھی۔ غرض یہ کہ ہم دھر لیے گئے۔ اب بدلی کر کے ہم کو جرمنی بھیج دیا گیا۔

''اور سزا نہیں دی گئی؟''

''کہیں بھی نہیں۔ بس دھمکا دیا گیا کہ اگر پھر یہ حرکت کی تو باہر نکلنا بند کر کے ٹیڑھے کاموں پر لگا دیے جاؤ گے۔ لیکن کام ہمارا وہی کھیتی باڑی کا رہا۔ جگہ بھی پہلے سے اچھی ہی ملی۔

وہاں ہم چھوکریوں کے ساتھ موج کرتے تھے۔ دن کے وقت جب ہم کھیت میں کام کرتے تب تو تھوڑی تھوڑی دور پر سنتری کھڑے رہتے تھے کہ کوئی قیدی بھاگ نہ نکلے، لیکن رات کو ہم چپکے سے باہر کھسک لیتے تھے۔ میرے دوست نے تو ایک کو گابھن بھی کر دیا۔ ہمارے سینوں پر نمبر کڑھے ہوے تھے، ان پر ہم سفید رومال ٹانک لیتے اور ہر رات آٹھ بجے کھیتوں سے باہر نکل آتے۔ ملاقاتوں کا ٹھکانہ ریلوے اسٹیشن کے پاس بنا رکھا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ ہم کو ان لڑکیوں کی زبان نہیں آتی تھی۔ میری والی کے بال سنہرے تھے۔ میں اس کو بہت پیار کرنے لگا اور کسی بھی وقت وہ میرے دھیان سے نہیں اترتی تھی۔ آخر یاروں نے تاڑ لیا اور ہماری شکایت جڑ دی۔ ہم بھی ایک دو رات باہر نہیں نکلے۔ پھر ہم نے ملاقاتوں کی جگہ بدل دی۔''

''تو آخر جرمنوں نے تمھارے ساتھ برائی کیا کی؟''

''کچھ بھی نہیں۔ ہم اپنا کام پکا کرتے تھے اس لیے وہ بھی ہم سے راضی تھے اور ہمارے مطلب سے مطلب نہیں رکھتے تھے۔ ہاں، دو یا تین بار اتنا ضرور ہوا کہ انھوں نے ہمارے خط نہیں پہنچائے۔''

''کیسے خط؟''

''خطوں کی ادلا بدلی ہوے جا رہی تھی نا۔ جرمن قیدیوں کے ناتیوں کے خط فرانسیسی وصول کرتے تھے، اسی طرح فرانسیسیوں کے خط جرمن وصول کرتے اور ایک دوسرے کو پہنچا دیتے تھے۔''

''پھر کیا بات ہوگئی؟ انھوں نے تمھارے خط کیوں روک لیے؟''

''ان کا کہنا تھا کہ فرانس میں جو جرمن افسر گرفتار ہوے ہیں ان کو فرانسیسیوں نے الجیریا بھیج دیا ہے اور وہاں ان سے کڑی محنت لی جاتی ہے، اور دوسرے جرمن قیدیوں کے ساتھ بھی برا بیوہار ہو رہا ہے، اس لیے جرمنوں نے ہمارے خط روک لیے۔ مگر خیر، جب ہم نے سنا کہ جرمنی کی ہار ہوگئی اور ہماری فرانس کو واپسی پکی ہے تو خوب خوب فیل مچائے۔ اب کس کی مجال تھی کہ ہم سے بولتا۔ جو ریل گاڑی ہم کو فرانس لا رہی تھی اس کے ڈبے پر ہم نے قیصر ولیم کی تصویر بنا دی تھی۔ اس کا بدن سوٗر کا بنایا تھا اور نیچے لکھا تھا: 'جرمنی مردہ باد۔' اس پر ان لوگوں نے ریل روک

لی اور... بس بلوا ہوتے ہوتے رہ گیا۔

❁

قریب آدھے گھنٹے تک اپنی اسیری کی روداد بیان کرنے کے بعد اس نے ایک آہ بھری اور بولا:

''میری زندگی کے سب سے اچھے دن وہی تھے جب میں جرمنی میں قید تھا۔'' پھر اس نے جھاڑو اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

❁❁

(فارسی عنوان: ''اسیر فرانسوی'')

غلام حسین ساعدی

بھکاری

صحرا۔ بیچوں بیچ میں ایک کنواں جس کے گرد کانٹوں دار تار کی باڑھ کھنچی ہوئی ہے۔ باڑھ کے سلانچے کے پاس ایک بڑا سا ڈول رکھا ہوا ہے۔ ڈول پر موٹی رسی لپٹی ہوئی ہے۔

مسافر، تھکا ہارا اور ننگے پاؤں، پتلون قمیص پہنے، پسینے میں تر بتر، اسٹیج پر آتا ہے۔ بہت پیاسا ہے، زبان باہر لٹکی پڑ رہی ہے۔ کنویں کی طرف لپکتا ہے۔ باڑھ کے گرد کئی چکر کاٹتا ہے اور گردن بڑھا بڑھا کر کنویں کو دیکھتا ہے۔ تاروں کے بیچ سے گذرنا چاہتا ہے۔ نہیں گذر پاتا۔ تاروں کو پکڑتا ہے اور کھینچتا ہے۔ اس کی انگلیاں زخمی ہو جاتی ہیں۔ پھر کنویں کے گرد دوڑ لگاتا ہے اور کنویں کو دیکھتا ہے۔ پھر تاروں کو پکڑتا ہے اور کھینچتا ہے۔ پھر کنویں کے گرد دوڑتا ہے اور ہانپتا ہے۔

رک جاتا ہے اور کچھ سوچنے لگتا ہے۔ ایک سلانچے کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور ناخنوں سے سلانچے کے اردگرد کی مٹی کھودتا ہے۔ سلانچے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتا ہے اور زور کرتا ہے۔ سلانچہ اکھڑ آتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے سلانچے کو بھی اکھاڑ لیتا ہے۔ تار زمین پر گر جاتے ہیں۔ ایک طرف سے کنویں کا راستہ کھل جاتا ہے۔

خالی ڈول کو اٹھاتا ہے اور کنویں میں ڈالتا ہے۔ کنواں گہرا ہے۔ مسافر کے ہاتھ میں رسی کا سرا رہ جاتا ہے۔ بھاری ڈول کو اوپر کھینچتا ہے۔ بھری ہوئی بڑی سی مشک ڈول میں رکھی ہے۔ مشک کو تعجب سے دیکھتا ہے، ڈول میں سے نکالتا اور ہلاتا ہے۔ پانی کی آواز آتی ہے۔ جلدی جلدی مشک کا دہانہ کھولتا اور اسے ڈول میں انڈیلتا ہے۔ مشک ہوا سے پھولی ہوئی ہے۔ کنویں کی تہہ میں قہقہے لگتے ہیں۔ مسافر ڈر جاتا ہے اور مشک کو کنویں میں پھینک دیتا ہے۔ مشک اوپر اچھال دی جاتی ہے۔

ڈول کنویں میں ڈالتا ہے اور رسی کو جھٹکے دیتا ہے اور اوپر کھینچتا ہے۔ ایک بڑی سی پرانی کتاب باہر آتی ہے۔ کتاب کو اٹھالیتا ہے اور اس کے ورق پلٹتا ہے۔ بڑے شوق سے اس کی تصویریں دیکھنے لگتا ہے۔ کنویں کی تہہ میں رونا ہوتا ہے۔ کتاب مسافر کے ہاتھ سے نکل کر کنویں میں گرجاتی ہے۔ انتظار کرتا ہے۔ کتاب اوپر نہیں آتی۔

ڈول کنویں میں ڈالتا ہے، رسی کو جھٹکے دیتا ہے، اوپر کھینچتا ہے۔ کٹا ہوا ایک ہاتھ اور ایک پیر ڈول میں رکھ دیا گیا ہے۔ دہشت زدہ ہوجاتا ہے۔ کنویں کے اندر قہقہے لگتے ہیں۔ مسافر ڈول کو کنویں میں الٹ دیتا ہے۔ کٹے ہوئے ہاتھ اور پیر کو پھر باہر پھینک دیا جاتا ہے۔

کنویں میں ڈول کو ڈالتا ہے اور رسی کو جھٹکے دیتا ہے۔ اوپر کھینچتا ہے اور دیکھتا ہے۔ ایک بہت بڑا ہیرا ڈول میں سے نکالتا ہے۔ خوشی خوشی ہیرے کو انگلیوں میں گھماتا ہے۔ کنویں کے اندر رونا ہوتا ہے۔ مسافر کچھ سوچتا ہے اور ہیرے سے کھیلتا رہتا ہے۔ ہیرا اس کی انگلیوں سے چھوٹتا ہے اور کنویں میں گرجاتا ہے۔ ہیرے کو دوبارہ اوپر نہیں پھینکا جاتا۔

جھلا کر ڈول کو کنویں میں ڈالتا ہے، رسی کو جھٹکے دیتا ہے اور اوپر کھینچتا ہے۔ ایک گلا ہوا مردہ سانپ ڈول میں رکھ دیا گیا ہے۔ دہل جاتا ہے۔ کنویں کے اندر قہقہے لگتے ہیں۔ ڈول کو کنویں میں پلٹ دیتا ہے۔ مردہ سانپ کو پھر باہر پھینک دیا جاتا ہے۔

مسافر زمین پر بیٹھ جاتا ہے اور کچھ سوچنے لگتا ہے۔ مردہ سانپ اور کٹے ہوئے ہاتھ پیر اور خالی مشک کو برابر برابر رکھتا اور دیکھتا ہے۔ کٹے ہوئے ہاتھ پیر کو اپنے ہاتھ پاؤں سے ملا کر دیکھتا ہے۔ اٹھتا ہے اور ڈول کنویں میں ڈالتا ہے۔ رسی کو جھٹکے دیتا ہے اور اوپر کھینچتا ہے۔ ایک بڑا انار باہر آتا ہے۔ کنویں کے پاس سے ہٹ آتا ہے اور انار پر منہ مارتا ہے۔ انار پلپلا ہوچکا ہے۔ کنویں

کی تہہ میں رونا ہوتا ہے۔ مسافر طیش کھا کر قریب جاتا ہے اور انار کو کنویں میں پھینک دیتا ہے۔

رونے کی آواز ایک دم سے رک جاتی ہے۔ مسافر پچھتاتا ہے۔ انتظار کرتا ہے۔ لجاجت کے ساتھ کنویں کو دیکھتا ہے۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ انار کو باہر نہیں پھینکا جاتا۔

مسافر ڈول کو ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے ہوئے کئی مرتبہ کنویں کے گرد دوڑ لگاتا ہے۔ آسمان کو اور افق کو دیکھتا ہے۔ کچھ نہیں ہوتا۔

کنویں کے کنارے بیٹھ جاتا ہے اور سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔ ایک مذہبی مرقع آہستہ آہستہ کنویں سے ابھرتا ہے۔ مسافر ہاتھ پھیلا کر مرقع کو پکڑ لیتا ہے اور سینے سے لگاتا ہے، بھنچی بھنچی آواز میں روتا ہے۔ کنویں کے اندر بہت سے لوگوں کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مسافر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگتے ہیں۔ چند لمحے گذرتے ہیں۔ کنویں کے اندر رونے کا انداز دھمکانے کا سا ہو جاتا ہے۔ مسافر مرقع کو کنویں کے حوالے کر دیتا ہے۔ انتظار کرتا ہے۔

مرقع دوبارہ اوپر نہیں آتا۔

کچھ دیر سوچتا رہتا ہے۔ ڈول کو اٹھاتا ہے اور سوچتا ہے۔ پھر اس کو کنویں میں ڈالتا ہے اور سوچتا ہے۔ اوپر کھینچتا ہے۔ ڈول میں ایک پستول رکھ دیا گیا ہے۔ پستول کو اٹھا لیتا ہے۔ کنویں میں سے ہنسنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پستول کو کنویں میں ڈال دیتا ہے۔ اسے دوبارہ اوپر اچھال دیا جاتا ہے اور قہقہے لگتے ہیں۔ پھر پستول کو ٹھوکر مار کر کنویں میں گرا دیتا ہے۔ تیسری بار قہقہے لگتے ہیں اور پستول اوپر اچھال دیا جاتا ہے۔

مسافر پستول ہاتھ میں لیتا ہے اور کنویں کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ پستول کو اور کنویں کو دیکھتا ہے۔ زبان سے پستول کے فولاد کی ٹھنڈک کو محسوس کرتا ہے۔ اس کی نال کو منھ میں لیتا ہے اور بے خیالی میں لبلبی دبا دیتا ہے۔

گولی کا تڑاقا اسٹیج پر گونجتا ہے۔ مسافر کا جسد کنویں میں گر جاتا ہے۔ کنویں میں سے زور

دار قہقہوں کی آواز بلند ہوتی ہے۔
کچھ دیر تک خاموشی رہتی ہے۔
مسافر کا لاشہ اوپر اچھال دیا جاتا ہے۔

❄❄

(فارسی عنوان: ''گدا'')

غلام حسین ساعدی

روضے والی

1

مہینے کے اندر اندر میں نے قُم کے تین پھیرے کیے۔ آخری پھیرے میں جیسے میرا دل بول رہا تھا کہ کام بگڑ جائے گا، پھر بھی میں آدھی رات کو ایک کھڑ کھڑیا لاری میں چل کر صبح ہوتے سید اسداللہ کے گھر جا پہنچی۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو عزیزہ خانم باہر نکلیں۔ مجھے دیکھا تو اچک پڑیں۔ برا سا منھ بنایا۔ دروازے پر سے ہٹ گئیں اور دیدے نکال کر مجھے گھورنے لگیں۔ پھر بولیں:

''بڑی خانم! آپ گئیں نہیں؟''

میں نے کہا سنا کچھ نہیں، بس سلام علیک کر کے اندر آ گئی۔ ڈیوڑھی سے نکل کر صحن میں پہنچی۔ بچے ابھی ابھی سو کے اٹھے تھے اور حوض پر منھ ہاتھ دھو رہے تھے۔ سب کے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے دیکھنے لگے۔ میں دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ بقچہ پہلو میں رکھ لیا اور وہیں جمی رہی۔ عزیزہ خانم نے پھر پوچھا:

''سچ سچ بتایئے، بڑی خانم، آپ گئی نہیں تھیں؟''

گئے تو تھے، جنیا،'' میں نے کہا، ''پھر لوٹ آئے۔''

''لوٹ ہی آنا تھا تو پھر گئی کیوں تھیں؟'' عزیزہ خانم بولیں، ''یہیں رہتیں، ہم بھی خاطر جمع رہتے۔''

میں ہنس پڑی اور بولی:

''اسی لیے تو ہم چلے آئے کہ تم خاطر جمع ہو جاؤ۔ لیکن جنیا، اس بار ہم زیارت کو نہیں آئے ہیں، کچھ اور ہی کام ہے۔''

بچوں نے آ کر مجھے گھیر لیا۔ عزیزہ خانم کی تیوریاں چڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھ سے ذرا ہٹ کر کیاری کے پاس بیٹھ گئیں۔ پوچھا:

''اور کون سا کام؟''

''آئے ہیں اپنے واسطے بالشت بھر جگہ مول لینے،'' میں نے کہا، ''تمھیں پتا ہے؟ ہم نے خواب میں دیکھا ہے۔ تین رات پہلے دیکھا ہے کہ بس جا رہے ہیں۔۔۔''

''برے کلمے منھ سے نہ نکالیے،'' عزیزہ خانم بات کاٹ کر بولیں۔ میں نے کہا:

''ہم تو ٹھکانے لگ ہی چکے۔ ضرور تھا کہ۔۔۔''

عزیزہ خانم آگے کو سرک آئیں، اور بولیں:

''مگر پیسے تو آپ پاس تھے نہیں؟''

''تھے کیوں نہیں،'' میں نے کہا اور بقچے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ تلملا کر کھڑی ہو گئیں اور کہنے لگیں:

''تو جب پیسے آپ پاس ہیں پھر سید بیچارے سے کیوں ہر سٹے رقم اینٹھا کرتی ہیں؟ جب نہ تب انھیں کا گلا کاٹتی ہیں۔ سید کو دوڑتے دوڑتے صبح سے شام ہو جاتی ہے، پھر بچوں کا پیٹ نہیں بھر پاتے۔ اوپر سے آپ ہیں کہ جان کو لگی ہوئی ہیں۔ جب دیکھو چلی جا رہی ہیں اور چلی آ رہی ہیں۔''

پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگیں کہ میں کچھ بولوں، لیکن میں بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے انھیں دیکھتی رہی، بولی کچھ نہیں۔

عزیزہ بڑبڑاتی ہوئی کوٹھے پر چلی گئیں۔ پیچھے پیچھے بچے بھی۔ میں وہیں دیوار سے لگی بیٹھی رہی، پھر آنکھیں موند کر سو گئی۔ خواب میں دیکھا کہ سید دکان سے واپس آ گیا ہے، اور بیوی کے ساتھ پیڑ تلے کھڑا ہے۔ دونوں میری ہی باتیں کر رہے ہیں۔ سید پیڑ سے ایک رسی باندھ رہا ہے اور بیوی تیز تیز بول رہی ہیں۔ میں سوتے سے چونک پڑی تو دیکھتی ہوں سچ میں سید آ گیا ہے اور ڈیوڑھی میں بیوی کے ساتھ زور زور سے باتیں کر رہا ہے۔ کہہ رہا تھا:

''آخر کروں تو کیا کروں؟ جو بھی ہو، وہ میری اماں ہیں۔ تمھیں کچھ بتاؤ۔''

''میں کیا جانوں،'' عزیزہ خانم بولیں، ''اب کے تو آئی ہیں قبر مول لینے۔ قبرستان جا کر پیسے بھی جمع کر آئی ہیں۔ گٹھری بھر رقم لائی ہیں۔ آخر یہ اوروں پاس کیوں نہیں جاتیں؟ بھلا اتنی بیٹیاں بیٹے ہیں، ایک تمھیں پتلی گردن والے ہو کہ ہر بار آخر تمھارے ہی گلے پڑتی ہیں۔ سید عبداللہ، سید مرتضیٰ، جواد آقا، سید علی، ایک سے ایک، پھر وہ صفیہ، حوریہ، امینہ آغا، یہ ان کے بیٹے بیٹی نہیں ہیں کیا؟ داماد بھی سب پیسے والے...''

سید کچھ دیر چپ چاپ سنتا رہا، پھر بولا:

''ٹھیک ہے بھئی، جو جی میں آئے کرو۔ میرا تو ناک میں دم آ گیا ہے۔''

دونوں ڈیوڑھی سے نکل کر سامنے آئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سید دھیرے دھیرے چلتا ہوا آیا اور کوٹھے پر چڑھ گیا۔ پھر دبے پاؤں نیچے اترا اور باہر نکل گیا۔ مجھے دروازہ کھلنے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد سارے دن میں دیوار سے لگی جاگتی سوتی رہی۔ جاگی، تھوڑی سی روکھی نان بقچے سے نکالی، کھائی، پھر سو گئی۔ آنکھ کھلی تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ اوپر کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ مجھے پتا تھا عزیزہ خانم اور بچے مل جل کر بیٹھے ہوں گے۔ میں کچھ دیر کھانستی رہی، پھر حوض پر گئی، پانی اچھالتی رہی۔ کوئی باہر نہیں نکلا، ہمت کر کے زینوں پر چڑھی، اوپر پہنچی، دیکھا سب لیمپ کے ارد گرد بیٹھے ہیں۔ میں وہیں اندھیرے میں کھڑی انھیں دیکھتی رہی۔ کھانا ہو رہا تھا۔ سب کھا چکے تو میں نے دروازے میں سر ڈالا۔ لیمپ کی روشنی پورے کمرے میں نہیں پہنچ رہی تھی اس لیے کسی نے مجھے دیکھا نہیں۔ پھر میں نے دھیرے سے پکارا:

''عزیزہ خانم، عزیزہ خانم!''

ماہ رخ، اسداللہ کی بڑی والی، اچھل پڑی اور اس کے منھ سے چیخ نکل گئی۔ سب گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ عزیزہ نے لیمپ اکسایا، پھر بڑھ کر میرے سامنے آ گئیں اور بولیں:

''آپ آخر چاہتی کیا ہیں؟ کہ میرے بچے دہل کے مر جائیں؟''

میں پیچھے ہٹ گئی، پوچھا:

''سید نہیں آئے؟''

''آج رات وہ گھر نہیں آئیں گے،'' عزیزہ بولیں۔

''اچھا تو ہم کہاں لیٹیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کیا جانوں،'' عزیزہ خانم نے کہا، ''جہاں جی میں آئے وہاں آرام کیجیے۔''

میں وہیں چوکھٹ کے پاس پڑ رہی۔ نیند آ گئی۔ صبح نماز کے لیے اٹھی تو سمجھ چکی تھی عزیزہ خانم کچھ دینے دلانے کی نہیں، اس لیے نماز پڑھ کر بقچہ سنبھالا اور روضے کو روانہ ہوگئی۔ وہاں مسجد کے چھتے میں جا بیٹھی، پھر ہاتھ پھیلا دیا، منہ پر گھونگھٹ لے لیا، اور پھر سوگئی۔ دھوپ پھیل گئی تو اٹھی۔ آس پاس جو پیسے پڑے تھے انھیں بٹور کر بقچے کے کونے میں باندھا اور نکل کھڑی ہوئی۔

دوپہر ہوتے مکان پر آئی، بچوں کے لیے ٹکے والی مٹھائی کی چڑیاں اور حلوا سوہن خریدا تھا، دروازہ کھٹکھٹایا۔ ماہ رخ ڈیوڑھی میں آئی۔ پٹ اتنا سا کھول کر جھانکا، فوراً دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ میں نے پھر کھٹکھٹانا شروع کیا۔ دروازے کے پیچھے کسی عورت نے آکر بتایا کہ سید اسداللہ پورے تین مہینے سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد سناٹا۔ میں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہی عورت پھر آئی اور بولی، پتا نہیں وہ لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔ مجھے کوئی کام تو تھا نہیں، سہ پہر تک دروازے پر بیٹھی رہی کہ شاید سید اسداللہ آجائے۔ جب دیکھا اسی طرح سناٹا کھنچا ہوا ہے تو اٹھ کھڑی ہوئی۔ اچانک خیال آیا کہ جا کر سید کی دکان ڈھونڈھوں۔ مگر جہاں بھی گئی، سید اسداللہ آئینے والے کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ پتھر والوں کے قریب ایک آئینے والا سید اسداللہ کر کے تھا تو مگر وہاں ایک آدمی عمامہ باندھے عبا پہنے بیٹھا تھا۔ سید کبھی عمامہ نہیں باندھتا، یہ میں جانتی تھی، اس لیے وہاں سے نکل آئی۔ نماز کا وقت ہوگیا تو روضے چلی گئی۔ وہاں پھر خیرات اکٹھا کی اور پھر بازار میں آگئی۔ قریب مغرب تک اسداللہ کو یہاں وہاں ڈھونڈھتی رہی، بالکل ان دنوں کی طرح جب وہ بچہ تھا اور کہیں گم ہوجاتا تو میں اسے کھوجتی پھرتی تھی۔ میں نے سوچا اس کے گھر جا کر دروازے پر بیٹھ رہوں، لیکن عزیزہ خانم کے ڈر سے نہیں گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس رات مجھ کو سب سے ڈر لگ رہا تھا۔ پھر میرے جی میں یہ سمائی کہ اسی دن لوٹ جاؤں۔ اسی خیال سے گاڑیوں کے اڈے پر پہنچی۔ اچانک دیکھتی ہوں کہ سید اسداللہ ہاتھوں میں سامان اٹھائے اڈے سے نکل رہا ہے۔ میں نے اسے پکارا تو رک گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑلیا، صدقے قربان ہوئی، دعا پڑھ کر دم کی۔ وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ زبان اس کی بند ہوگئی تھی، بس بھونچکا سا

کھڑا مجھے تک رہا تھا۔ میں نے کہا:

''گھبراؤ نہیں، جانی، ہم تمھارے گھر نہیں آ رہے ہیں۔ معلوم ہے عزیزہ خانم ہماری صورت دیکھنے کی روادار نہیں ہیں۔ تم بھی تو تین مہینے ہوئے وہاں سے اٹھ آئے ہو۔''

سید کہنے لگا:

''اماں، قصور تمھارا ہی ہے۔ تیسرے پہر تم کو روضے میں دیکھا۔ بھیک مانگ رہی تھیں! وہاں تم سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اف! اگر کسی نے تمھیں پہچان لیا تو میری کیا آبرو رہ جائے گی؟''

میں کچھ نہیں بولی۔ سید نے پوچھا:

''تو کہیں رہنے کا ٹھکانہ ہوا؟''

''ہمارا غم نہ کھاؤ،'' میں نے کہا، ''یہیں پر کیا موقوف، جہاں بھی جائیں گے زمین کا ٹکڑا تو نکل ہی آئے گا۔''

پھر مجھ سے رہا نہیں گیا، رونے لگی۔ سید اسداللہ کو بھی رونا آ گیا لیکن چھپا لے گیا۔ پوچھنے لگا:

''تو روتی کیوں ہو؟''

''اپنے غریب الوطن امام پر رو رہے ہیں،'' میں نے کہا۔

سید نے جیبیں ٹٹولیں، ایک تومان کے پیسے نکال کر مجھے دیے اور بولا:

''اماں، اس شہر میں تمھارا رہنا ٹھیک نہیں۔ اچھا یہی ہے کہ سید عبداللہ کے پاس چلی جاؤ۔ مجھ سے تو تمھارے لیے کچھ ہو نہیں سکتا۔ یہ بھیک مانگنا اور صدقہ خیرات وصولنا ہمارے تمھارے لیے کوئی عزت داری کی بات نہیں۔ کل نہیں تو پرسوں کوئی نہ کوئی تمھیں دیکھ ہی لے گا اور سب کو پتا چل جائے گا کہ حاجی سید رضی کی گھر والی بھیک مانگتی ہے۔ چلی جاؤ سید عبداللہ پاس۔ اس کی بیوی تو عزیزہ کی طرح چڑ چڑی بھی نہیں ہے۔''

ہم گاڑیوں کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے ایک ڈرائیور سے کہا:

''بھیا، اللہ واسطے ان بڑی بی کو شوش میں اتار دینا۔ ثواب کا کام ہے۔''

2

سید عبداللہ کے ہاں سب کا دل مجھ میں لگا ہوا تھا۔ سید اپنی بی بی کے ساتھ گاؤں چلا گیا تھا۔ گھر میں بچے ہی بچے تھے۔ رخشندہ کی ابلی ہوئی آنکھوں والی مٹلی بہن بچوں کے لیے کچھ بن رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو باچھیں کھل گئیں۔ بچے بھی نہال ہو گئے۔ رخشندہ اور سید عبداللہ کے جلدی لوٹنے کی امید نہیں تھی۔ روٹی، سالن، جو چاہو ڈھیروں موجود۔ بچے میرے اوپر لدے پڑ رہے تھے۔ صحن بھر میں میرے پیچھے پیچھے لگے ہوے تھے۔ جاننا چاہتے تھے کہ میرے بقچے میں کیا ہے۔ میں کیونکر بتا دیتی۔ انھیں بھی اپنے بڑوں کی طرح فکر تھی کہ میرے بقچے کی ٹوہ لیں۔ رخشندہ کی بہن دالان میں بیٹھی ٹھٹھے لگا رہی تھی۔ اس نے اپنے کھلے ہوے بال پیچھے سمیٹے اور پوچھا:

''بڑی خانم، آخر اس بقچے میں ہے کیا؟''

یہ میں نہیں بتا سکتی تھی۔ بس اتنا کہہ کے رہ گئی:

''کچھ بھی نہیں، ہونا کیا ہے؟''

باہر جانے کو ہوئی تو بچے بھی ساتھ چلنے کو مچل گئے، لیکن میں کسی صورت ان کو بہلا پھسلا کر سڑک پر آ گئی۔ چوراہے پر ایک گول میدان سا تھا، بیچ میں گڑھے کی طرح دھنسا ہوا، وہیں ایک کنارے بیٹھ گئی۔ لیکن آدمی ادھر کم آتے تھے، وہاں مانگنے سے ملنا ملانا کچھ نہیں تھا۔ ہاں بس ایک فقیری کا ثواب تھا۔

گھر واپس آئی تو رخشندہ کی بہن بولی:

''بڑی خانم خصم پاس گئی تھیں!''

بچے ہنس پڑے اور سب نے رٹ لگا دی:

''خصم پاس گئی تھیں! خصم پاس گئی تھیں!''

پھر سب ایسی ایسی باتیں پوچھنے لگے کہ مجھے بھی ہنسی آ گئی اور کچھ جواب دیتے بن نہیں پڑا۔ رخشندہ کی بہن مجھ کو چاہتی تھی، بہت چاہتی تھی۔ یہ مجھے پتا تھا۔ خود بھی کہا کرتی تھی کہ میرا کام کرنے میں اس کا بڑا جی لگتا ہے۔ میں نے اس سے کہا میرے لیے ایک جھولا سی دو۔ اس نے سی بھی دیا۔ اور کتنا بڑا سا! سینے بیٹھی تو کہنے لگی:

''جھولے کا سینا اچھا شگون ہوتا ہے۔''

میں نے سوچا اس میں کون سا اچھا شگون ہوگا، مگر اس نے شاید ٹھیک کہا تھا اس واسطے کہ دوسرے ہی روز منھ اندھیرے سید عبداللہ اور رخشندہ گاؤں سے آگئے۔ رخشندہ بھی مجھے دیکھ کر عزیزہ کی طرح اچک پڑیں۔ سید عبداللہ خوب موٹا تازہ سرخ سفید ہو رہا تھا۔ ڈاڑھی بھی لمبی ہوگئی تھی۔ لیکن اس نے جیسے مجھے دیکھا ہی نہیں۔ میں نے سوچا چھوڑو، یہاں سے بھی ٹل ہی جاؤ۔ کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب پہلے دن کی طرح بچوں کے ساتھ ہنسنا بولنا بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ رخشندہ کی بہن الگ ساری دل لگی بھول گئی تھی۔ سید کچھ دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا، پھر بولا:

''اماں، آؤ، جس گاڑی پر ہم آئے ہیں اسی پر گاؤں چلی جاؤ۔ میں خود جاڑوں میں تم کو دیکھنے آؤں گا۔''

بچے میرے واسطے نان پنیر لے کر آگئے۔ میں نے اپنا بقچہ سنبھالا، رخشندہ کی بہن والا جھولا بھی اٹھا لیا، سید کی دی ہوئی لاٹھی تھامی اور کہا:

''کوئی بات نہیں، جا رہے ہیں۔''

بچوں کو پیار کر کے باہر نکل آئی۔ گاڑی دروازے ہی پر لگی ہوئی تھی، سوار ہوگئی۔ بچے میرے پیچھے پیچھے گاڑی تک آئے۔ رخشندہ اور ان کی بہن نہیں آئیں۔ سید نے دو تومان کا خردہ بھیج کر کہلا دیا تھا کہ گاؤں ہی میں رہنا، واپس نہ آجانا۔ میں نے دالان میں رخشندہ کی بہن کے رونے کی آواز سنی۔ رخشندہ کی بڑی بٹیا کہنے لگی:

''خالہ ڈرتی ہے، ڈرتی ہے ابا اسے گھر سے نکال دیں گے۔''

دوپہر ہوتے گاؤں پہنچی۔ گاڑی سے اتری۔ ایک کمرے میں پہنچا دی گئی۔ اس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی، بس ہر کونے میں طاقچے تھے۔ میں نے دروازہ بند کر لیا اور لیٹ رہی۔ ہاتھ پیر، پوری جان درد کر رہی تھی۔ رات کو مجھے نان اور مکھن ملا۔ نماز کے لیے اٹھی، دروازہ کھولا۔ مکان کے سامنے گھاٹی تھی۔ بڑا سا چاند نکل آیا تھا اور سارے میں چاندنی پھیل گئی تھی۔ دور سے بھیڑیے کی آواز آرہی تھی حالانکہ ابھی سردیاں نہیں شروع ہوئی تھیں۔ مکان کی چھت پر کوئی چڑیا

کٹ کٹ کرتی ٹھونگیں مار رہی تھی۔

اس کے بعد میں بہت کم گھر سے باہر نکلی۔ بس کمرے میں پڑی اپنے بچوں کا سوچا کرتی کہ سب کیسے الگ الگ کونوں میں پڑے ہیں۔ میرا دل ان کے لیے کلپتا تھا۔ سب سے زیادہ پریشانی صفیہ کی تھی کہ اس کا مسنڈا میاں جواد آقا ہر وقت اسے کونچا کرتا تھا۔ بس ایسے ہی وہم گھیرے رہتے تھے۔ وہم اکیلی جان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ سب سے بدتر یہ کہ میں صدقہ اکٹھا نہیں کر پا رہی تھی۔ سہ پہر کو لاٹھی ٹیکتی ہوئی میدان کی طرف جا نکلتی اور رات تک وہیں بیٹھی رہتی۔ جوتیاں الگ کھو گئی تھیں۔ رات کو گھر لوٹتی تو بچوں کی طرح خواب میں جوتیاں دیکھتی۔ دیکھتی کہ جوتیاں مل گئی ہیں اور میں آرام سے کانٹے کنکر پر چل لیتی ہوں۔ کئی بار رات کو کپڑے بھی خراب کر لیے۔ پیری اور صد عیب۔ حالت میری اچھی نہیں تھی۔ پہلے تو کوئی کوئی خبر بھی لے لیتا تھا، مگر یہ دیہاتی بندے بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔

ایک رات تو بہت دل کڑھا۔ ایسا لگا کہ وہ سب مجھے پکار رہے ہیں۔ میرے بیٹے، پوتے نواسے، بیٹیاں، سب پکار رہے ہیں۔ سب پہاڑ کے پیچھے سے مجھے آوازیں دے رہے ہیں۔ میں باہر آ گئی۔ نماز کا وقت جا تا رہا تھا۔ کچھ دور چل کر میں نے کان لگائے تو ایسا معلوم ہوا سچ مچ مجھے پکار رہے ہیں۔ صفیہ کے بچے رو رہے تھے اور مجھے بلا رہے تھے۔ رخشندہ کی لڑکی مجھے بلا رہی تھی۔ میں نے پکار کر کہا:

"آ رہی ہوں!"

دو دن پہلے میں نے شبیہ مبارک کی شمائل خرید لی تھی۔ سوچا تھا بھیک مانگنے کے لیے شمائل ضروری ہے۔ میں نے شمائل اور بقچہ اٹھایا اور چل کھڑی ہوئی۔ سڑک تنگ اور لمبی تھی لیکن چاند نکل آیا تھا جس سے کچھ روشنی ہو گئی تھی اور مجھے پیروں تلے زمین دکھائی دے رہی تھی۔

میں گاؤں سے باہر نکل آئی تھی۔ تھکن اتارنے کے لیے ایک طرف زمین پر بیٹھ گئی۔ اونٹوں کی گھنٹیاں سنائی دیں۔ ایک آدمی تھا اور تین اونٹ۔ میں نے منت کی کہ مجھے بھی ایک اونٹ پر بٹھا لے۔ اس نے بٹھا لیا۔ ایک پر آپ سوار ہوا۔ تیسرا اونٹ ہمارے پیچھے پیچھے چلا۔

کچھ دور جانے کے بعد میں نے گھوم کر دیکھا۔ اب گاؤں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس رات اور دوسرے دن چل کر ہم شہر پہنچ گئے۔ اونٹ والا مجھ سے پیسے نہیں لے رہا تھا۔ بس ذرا سی روکھی روٹی لے کر جیب میں ڈال لی، اور اونٹوں کو چھچکارا، چل دیا۔

پہلا ہی آدمی جو سامنے پڑا، میں نے اس کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ اس نے ایک بار شائل کو دیکھا، ایک بار میرے ننگے پیروں کو، اور آگے بڑھ گیا۔

3

جواد آقا کو میں نے یہ بتایا کہ کام پر نکلی ہوں۔ ایک پیٹ کا بھرنا کون بڑی بات ہے۔ کام کروں گی، پیٹ بھرلوں گی۔ بھیک مانگتی ہوں تو کوئی پیسے کے لیے تھوڑے مانگتی ہوں، ثواب کی خاطر مانگتی ہوں۔ مجھے بھیک کے ٹکڑوں کی خوشبو بھاتی ہے، انھیں کھانا نہیں۔ مجھے فقیری کا ثواب اچھا لگتا ہے۔

جواد آقا نے میرے منھ پر دروازہ بند کر دیا اور بولا مجھے گھر میں نہیں گھسنے دے گا۔ میں جانتی تھی کہ صفیہ کوٹھری میں چھپ کر رو رہی ہوگی، بلک رہی ہوگی کہ اس کی اماں کو گھر سے نکال دیا گیا۔ لیکن وہ مجھ سے بھی زیادہ ڈرپوک تھی، خیریت اسی میں جانتی تھی کہ جواد آقا کے آتے ہی آپ کو سنبھالے، آن کے بیٹھے، جواد آقا کو چائے دے، بچے کا پالنا ہلائے، اور میرا خیال بھی دل میں نہ لائے۔

سہ پہر کو جواد آقا بازار چلا جاتا تھا۔ میں نے سوچا اگر اس وقت گھر پہنچ جاؤں تو صفیہ مجھے کسی کونے بلوکھے میں اس طرح ٹکا سکتی ہے کہ جواد آقا کو پتا نہ چلے۔ لیکن دستک جو دی تو دروازے پر جواد آقا ہی آن کھڑا ہوا۔ تیکھی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا:

''کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں،'' میں نے کہا اور اپنا راستہ لیا۔

وہ پیچھے سے مجھے دیکھتا رہا یہاں تک کہ میں اس سے دفعان ہو کر سڑک پر آ گئی۔ وہاں میں نے بقچے سے شائل نکالی اور صدقہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن میرا دل چاہ رہا تھا کچھ کام کروں۔

میں نے اپنے آپ سے کہا میں کام کروں گی، بالکل کام کروں گی۔ اور اسی وقت کام آ بھی گیا۔ ایک دبلی پتلی لمبی سی عورت وہاں جیسے میرا ہی رستہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا:

''کپڑے دھوسکتی ہو؟''

میں نے کہا دھو سکتی ہوں، اور ہم روانہ ہوگئے۔ دیر تک چلتے رہے۔ ایک سڑک، دوسری سڑک۔ آخر ایک خالی ڈھنڈار گلی میں پہنچ کر ایک مکان میں داخل ہوے۔ لمبی سی اندھیری اندھیری ڈیوڑھی تھی۔ پھر ہم ایک بہت بڑے صحن میں آ گئے۔ وہاں چوطرفہ کمرے بنے ہوے تھے۔ حوض کی چبوتریا کے پاس کئی عورتیں خوب سنگھار پٹار کیے بیٹھی کھا پی رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی سب میری طرف گھوم پڑیں اور آپس میں کچھ باتیں کر کر کے ہنسنے لگیں۔ ان میں سے دو ایک میری اپنی بیٹیوں کی طرح اچھے قد کاٹھ کی خوب گوری چٹی تھیں۔ پھر سب باتیں کرتی رہیں، کرتی رہیں۔ آخر طے پایا کہ میں کپڑے نہ دھوؤں، بس دروازے پر بیٹھی رہوں، پتا نہیں کیوں۔ مجھے دروازے کے پاس بٹھا دیا گیا۔ میں نے شمائل اور بقچہ اٹھالیا، اس سکھتو کو نہیں اٹھانے دیا۔ مجھ سے کہہ دیا گیا کہ کوئی آدمی دروازہ کھٹکھٹائے اور ربابہ کو پوچھے تو دروازہ کھول کر اسے اندر آجانے دوں۔ ہلکا کام تھا۔ کسی نے دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ میں دعاے کمیل پڑھتی رہی۔ سب سے الگ تھلگ اندھیری جگہ تھی۔ صحن سے بولنے چالنے کی آوازیں آرہی تھیں، لیکن میں اپنے کاسے میں منھ ڈالے بیٹھی رہی۔

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، بتایا ربابہ سے ملنا ہے۔ مرگھلا سا آدمی تھا۔ اس نے اور کچھ نہیں بتایا، اندر چلا گیا۔ میں نے پھر دروازہ بند کر دیا۔ صحن سے کھلکھلانے کی آواز آئی۔ پھر سب کچھ پہلے کی طرح۔ اس کے بعد کوئی دروازے پر نہیں آیا۔ میں نے کہا یہ بہت اچھا ہے۔ یہاں چین سے بیٹھ سکتی ہوں، اور بیٹھے ہی بیٹھے مجھے نیند آگئی۔ خواب میں دیکھتی ہوں کہ ایک لمبی پتلی گلی میں جواد آقا ایک ہاتھ میں چھڑی، ایک میں چابک لیے میرے پیچھے آرہا ہے۔ میں بجلی کی طرح چمک کر بھاگی۔ اسی مکان پر پہنچی اور ڈیوڑھی میں گھس گئی، دروازہ بند کرلیا۔ اب وہ مجھے نہیں پاسکتا تھا۔ جواد آقا پہنچا اور دروازہ دھڑ دھڑانے لگا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ دروازہ واقعی پیٹا جارہا تھا۔ میرا دم سوکھا ہوا تھا۔ پھر میں نے خود کو کچھ سنبھالا، پوچھا:

''کون ہے؟''
دروازے کے ادھر سے کسی نے کہا:
''ربابہ!''

میں نے دروازہ جو کھولا تو سامنے جواد آقا کی صورت! میں نے دروازہ دھڑ سے بند کر دیا، تھر تھر کانپنے لگی۔ اس نے اور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ سکھٹو آ گئی۔ میں نے کہا:

''کھولنا نہیں، جواد آقا آ گیا ہے، میرا داماد۔''

جواد آقا تھا کہ دروازہ پیٹے جا رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ آخر عورت نے مجھے ایک کوٹھریا میں پہنچا دیا۔ میں نے اس کا کواڑ بند کر لیا۔ عورت نے ڈیوڑھی میں جا کر باہر کا دروازہ کھولا۔ جواد آقا اندر گھس آیا اور سیدھا صحن میں چلا گیا۔ عورتوں کے کھلکھلانے کی آواز آئی، اور پھر سب کچھ پہلے کی طرح۔

میں نے بقچہ اور شمائل اٹھائی اور بھاگی باہر۔ وہی مثل کہ اب نہ بھاگے گا تو کب بھاگے گا۔ میدانچے میں آ کر رکی تو لگتا تھا دل بھی رک جائے گا۔

4

اس رات میں نے خیرات نہیں لی۔ شمائل میری چادر کے اندر اور لاٹھی میرے ہاتھ میں تھی۔ نماز پڑھ لی تھی اور بقچے میں نان کافی تھی۔ مسجد میں یا کسی اور جگہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ ایک کالی گاڑی آئی، مجھے بٹھا لیا اور شہر کے باہر لے جا کر ایک پتلی سی اندھیری گلی کے نکڑ پر اتار دیا۔ گلی کے اس سرے پر ٹمٹماتی ہوئی سی روشنی تھی جیسے ماچس جل رہی ہو۔ بچوں کی شیطانی سے جان چھوٹ گئی تھی۔ اب اپنے کام کا وقت آ گیا تھا۔ گلی کے سرے پر پہنچی۔ ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر چلی گئی۔ بڑا سا باغ تھا، گھنے پیڑ، اور پانی کی بہتات۔ ایک پرانی قندیل شاخ سے لٹکی ہوئی جل رہی تھی۔ میں ایک چبوترے کے کنارے بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ قمر اور جانالی فاطمہ اور ماہپارہ بھی آن پہنچیں۔ ہم چاروں مل کر پہلے تو روئے، پھر اپنے اپنے دکھڑے سنانے لگے۔ قمر ٹھنگنی ویسی ہی موٹی تھی، البتہ اس کی توند پلپلا گئی تھی۔ ہاں جانالی فاطمہ گھل کر رہ گئی تھی، مگر اب

بھی ہنستی خوب تھی۔ اور اس کے بعد رونے بھی لگتی تھی۔ ماہپارہ مربھکی کے چہرے کی جھریاں اسی طرح کپکپارہی تھیں۔ اپنی انگلیاں دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ میں جان گئی کہ بھوکی ہے۔ بقچہ کھولا۔ روٹیاں نکالیں اور تینوں کو بانٹیں۔ قمر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے کیا نہ کرے۔ جانالی فاطمہ اپنا پھٹا پرانا بقچہ آگے دھرے ہنسے جارہی تھی اور روئے جارہی تھی۔ البتہ ماہپارہ نے پوری روٹی ختم کرلی تھی اور اب ہونٹ چبارہی تھی۔

پھر باتیں شروع ہوئیں۔ تینوں نے مجھ سے خوب گلے شکوے کیے کہ ہم لوگ اتنے دن سے یہاں پڑے ہیں اور تم دیکھنے بھی نہیں آئیں۔ میں نے بھی قسموں پر قسمیں کھائیں کہ میں یہاں تھی ہی نہیں، مگر ان کو یقین نہیں آیا۔ پھر بھیک ویک کی بات ہوئی۔ جانالی فاطمہ سے کتنا کتنا کہا، اس نے اپنا بقچہ کھول کر نہ دکھایا۔ میں سمجھ گئی کہ اس نے پارچوں کا کام چھوڑ دیا ہے۔ کیا پتا میرے بقچے کے اندر انھیں میں کا کوئی پارچہ ہو۔ پھر ہم حوض پر آئے۔ میں نے اپنے بچوں کا حال احوال سنایا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہیں، میں بھی ٹھیک ٹھاک ہوں، صدقہ لیتی ہوں اور شمائل کی زیارت کراتی ہوں، بقچہ ساتھ ہے اور ہمہ وقت تیار ہوں۔

ماہپارہ موٹی سی نان ختم کرجانے کے بعد بھی اسی طرح بھوکی تھی اور مجھ پر آنکھیں گاڑے ہوے تھی۔

جانالی فاطمہ نے پوچھا:

''شمائل دکھانے لگی ہو تو روضہ بھی پڑھتی ہوگی؟''

میں نے روضہ پڑھنا شروع کردیا۔

ہم چاروں درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ جانالی فاطمہ پہلے ٹھٹھا مار کر ہنسی، پھر رو پڑی، اور ہم سب نے، چاروں نے، رونا شروع کردیا۔ باغ کے اندر سے بھی رونے کی آوازیں آنے لگیں۔

5

دعاے علقمہ پڑھ چکی تو اچانک مجھے گھر اور اپنی جمع پونجی کا خیال ستانے لگا۔ گھر تو اپنا تھا نہیں، البتہ ساری جمع پونجی میں نے امینہ آغا کے یہاں رکھوادی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا کہ میں نے

جا کر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ مجھے دیکھا تو سب سناٹے میں آ گئے، جیسے قبر سے نکل کر آ رہی ہوں۔ میں کچھ بولی نہیں۔ امینہ آغا اور ان کی نواسیاں پاس آ کھڑی ہوئیں۔ بیٹی موجود نہیں تھی، نہ میں نے پوچھا کہاں ہے۔ جانتی تھی ہمیشہ کی طرح حمام کرنے گئی ہوئی ہوگی۔

امینہ آغا نے پوچھا:

''کہیے، اچھی تو رہیں؟''

''اپنا سامان دیکھنے آئے تھے،'' میں نے کہا۔

انھوں نے تہہ خانے کا راستہ بتا دیا، پھر خود بھی ساتھ ہو لیں۔ کہنے لگیں:

''سید مرتضیٰ اور جواد آقا اور حوریہ سامان کے چکر میں کئی پھیرے لگا چکے ہیں، لیکن میں نے کہہ دیا ابھی تو خیر سے سید خانم زندہ سلامت ہیں۔ جب ان کا وقت آن پہنچے گا تب آ کر حصہ بانٹ کیجیو۔''

ہم وہاں پہنچے۔ تہہ خانے میں فنائل کی گولیوں کی بو بسی ہوئی تھی۔ قالین اور چاندنیاں ایک کونے میں ڈال دی گئی تھیں اور سیل کر گلی جا رہی تھیں۔ آبگرموں کے نلکے، اور بڑے والے سماور، اور ٹین کے کنستر تلے اوپر ڈھیر تھے۔ دھانس ایسی کہ سانس لیے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ میری تینوں کرسیاں برابر برابر لٹا دی گئی تھیں اور ان پر تین بکری کے بچے آ کھڑے ہوئے تھے۔ کرسیوں کے پایوں سے پیال کے مٹھے لٹک رہے تھے۔ بکری کے بچوں نے لپک لپک کر پیال پر منھ مارے، پھر چاندنیوں پر بیٹھ کر جگالی کرنے لگے۔

''پیسوں کا کیا کیا، بڑی خانم؟'' امینہ نے پوچھا۔

''پیسے کیسے؟'' میں نے کہا۔

''عزیزہ نے خط میں لکھا تھا کہ آپ نے قبرستان میں جگہ مول لی ہے۔''

''تمھارے منھ میں گھی شکر،'' میں نے کہا، ''مگر پیسے کہاں تھے؟''

''آپ رہ کہاں رہی ہیں؟'' انھوں نے پوچھا، ''لیٹتی سوتی کس جگہ ہیں؟''

''جہاں بھی ہوا،'' میں نے کہا، ''مسجد ہی میں پڑ رہتے ہیں۔ قبرستانوں میں شمائل گردانی، روضہ خوانی کرتے ہیں۔ ہم ذاکرہ ہو گئے ہیں۔''

بچے یہ سنتے ہی کھل اٹھے۔ مجھے بڑا اچھا لگا۔ لیکن میں نے انھیں شمائل دکھائی تو ڈر گئے۔ آخرالزماں کے بچے حضور کی شبیہ سے ڈر گئے۔ امینہ نے پوچھا:

''اب تو آپ نشا خاطر ہوگئیں؟ دیکھ لیا، سب سامان موجود ہے نا؟''

''ہاں''، میں نے کہا، ''لیکن ہم سوچتے ہیں ایک بچی مل جاتی تو شمائل کا پردہ بنا لیتے۔ گناہ کی بات ہے نا کہ ہر پاک ناپاک کی آنکھ حضور کے جمال پر پڑے۔''

امینہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئیں اور بولیں:

''نہیں۔ یہ تو نہیں ہونے کا۔ آپ کے بچے راضی نہیں۔ میری جان کو آ جائیں گے۔ میں نہیں دے سکتی۔''

وہاں سے واپس آئی تو میرا دل پتھر ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا بھیک کی شمائل کو پردہ ضرور نہیں۔ اچھا ہے اس پر گرد اکٹھا ہو جائے۔ مٹی کا پردہ حضور کے جمال کو نامحرموں کی آنکھ سے بچائے رکھے گا۔

میں ایک تراہے پر بیٹھ گئی۔ شمائل کو دیوار سے ٹکا دیا اور روضہ پڑھنا شروع کیا۔ بھیڑ لگ گئی، فقط تماشا دیکھنے کو۔ کسی نے دیا کچھ نہیں۔

میں صرف مصائب پڑھ رہی تھی اور گریہ کر رہی تھی، اور وہ سب یوں ہی ٹھس کھڑے تھے۔ ناچار میں نے شمائل اٹھالی اور روانہ ہوگئی۔ لوگ میرے پیچھے پیچھے تھے۔ کئی گلیاں پار کیں۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہاں جاؤں۔ قبرستان پہنچی۔ لوگ اب بھی پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میں نے شمائل کو دیوار سے ٹکایا اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ لوگوں نے میرے چوگرد گھیرا بنا لیا۔ کوئی منھ سے کچھ پھوٹ نہیں رہا تھا۔ قبرستان کے اندر کہیں کوئی رو رہا تھا۔ ہم سب سن رہے تھے۔

6

اس کے دوسرے دن سے مجھے بھیک ملنا بند ہوگئی۔ گلیاں ناپتی پھر رہی تھی اور بچوں کا غول پیچھے لگا ہوا تھا۔ میں روضہ پڑھتی اور ایک کٹوری پانی پی لیتی۔ آواز پڑی ہوئی تھی۔ پیر الگ پھٹ گئے تھے، خون رس رہا تھا اور ناخن اکھڑے جا رہے تھے۔ گلے میں کوئی چیز پیدا ہوگئی تھی

کہ منھ سے بات ٹھیک طرح نہیں نکلتی تھی۔ قبرستان میں سوتی تھی۔ شائل پر اتنی گرد جم گئی تھی کہ حضور کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ بقچے میں کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ بھوک مجھے لگتی بھی نہیں تھی۔ پانی، بس پانی پی لیا کرتی تھی۔ دل پتھر ہوتا جا رہا تھا۔ منھ کے اندر ہتھیلی برابر گھاؤ ہو گیا تھا، اس سے بھی خون آتا رہتا تھا۔ پیسے کسی سے نہیں مانگتی تھی۔ اب ثواب کمانے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ لوگ ہمہ وقت مجھے گھیرے رہتے تھے۔ انھیں لوگوں میں دیکھتی تھی کہ میرے بیٹے پوتے بھی پیچھے کھڑے ہیں۔

جمعے کی رات دیر گئے قبرستان میں غسل خانے کے پچھواڑے بیٹھی تھی، نماز بھی نہیں پڑھی تھی، کہ دیکھتی ہوں سید مرتضیٰ کا بڑا لڑکا اور آقا مجتبیٰ چلے آ رہے ہیں۔ کہنے لگے تمھیں گھر لے جانے آئے ہیں۔ میں بھلا کاہے کو جاتی، مگر دونوں نے زبردستی پکڑ کر مجھے گاڑی میں ڈال دیا اور روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے، چلتے چلتے آخر اتر کر ایک بڑے احاطے میں گھسے، پھر اس سے نکل کر ایک اور احاطے میں۔ وہاں مجھ کو دم دلاسا دے کر درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس بٹھا کر آپ سامنے ایک کمرے میں چلے گئے جہاں بتی جل رہی تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے آدمی کو انھوں نے ایک پرچی تھما دی۔ اس نے پرچی پڑھی، کھڑکی کے پاس آ کر مجھ کو دیکھا اور سر ہلا دیا۔ سید مرتضیٰ کا لڑکا اور آقا مجتبیٰ دو مرتبہ باہر آئے، میری طرف دیکھا بھی نہیں، پھر احاطے سے نکل گئے۔ اب دو اور آدمی آئے، ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک اندھیرے گلیارے میں لے گئے۔ میرے ننگے پیر اینٹوں میں چپک رہے تھے۔ ہم ایک کمرے میں پہنچے۔ وہاں کارنس پر ایک کپی جل رہی تھی۔ کمرے کا فرش ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک کونے میں جگہ ملی اور میں وہیں بیٹھ گئی۔ اب سانسوں کی آوازیں سنائی دیں اور میں سمجھ گئی کہ یہاں اور بھی بہت لوگ ہیں۔ اس کے بعد مجھے نیند آ گئی۔ صبح اٹھی تو دیکھتی ہوں سارا کمرہ بھکاریوں سے بھرا پڑا ہے۔ تب ایکا ایک مجھے پتا چلا کہ میں فقیر خانے میں ہوں۔

میں دروازے کے پاس شائل اور بقچہ سنبھالے بیٹھی رہی، باقی سب روتے پیٹتے دعائیں مانگتے رہے کہ اللہ جلدی موت دے۔ میں نے روضہ خوانی شروع کر دی اور سب میرے گرد جمع ہو گئے، لیکن گریہ ایک نے بھی نہیں کیا۔

پکچھ کرنا دھرنا تو تھا نہیں، میں نے نماز پڑھی اور گوشتابہ کھایا۔ اب کسی بات کی پروا نہیں رہی تھی۔ جان گئی تھی کہ کوئی میرے واسطے پریشان نہیں۔ وہاں میں بہت دن رہی۔ کتنے ہی مر گئے، کتنے ہی نئے آئے، سب فاقوں زدہ کہ ہر وقت بس کھائے چلے جاتے تھے۔ لیکن کوئی بھی ان میں فقیر نہیں تھا، سب بھوکے تھے، فقط۔

اتنے لوگوں میں میں وہاں صرف ایک بڑھیا تھی کہ کسی سے بولتی چالتی نہیں تھی، بس بغچے میں اپنا بقچہ اور شمائل لیے اپنی دھن میں بیٹھی رہتی تھی۔ میں نے پھر سے روٹی کھانے کی عادت بنالی تھی اور پھر سے راتوں کو مجھے خواب میں صفیہ اور حوریہ اور سید اسد اللہ اور سید عبداللہ کے بچے آنے لگے تھے۔ میں بے نماز آدمی کی طرح ہر وقت بے آرام رہنے لگی۔ شروع کے خوابوں میں حضور کی بھی زیارت ہوئی، لیکن دھیرے دھیرے سب کچھ غائب ہو جاتا تھا۔ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی اور وہاں سے نکلنا بھی چاہتی تھی، مگر دروازے پر ایک بڈھا بیٹھا رہتا تھا کہ دیکھتے ہی لاٹھی تانتا اور کہتا تھا:

''ہش، ہش!''

آخر میرا دل ہولانے لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کروں تو کیا کروں۔ بس روضہ پڑھتی رہتی اور روتی رہتی تھی۔

ایک دن کمال، رضیہ کا بڑا بیٹا، بارہ سال کا ہوگا، وہ اپنے دوست کے ساتھ مجھے ڈھونڈھتا ہوا آگیا۔ میں دروازے پر گئی۔ صفیہ نے میرے لیے نان پیاز بھجوائی تھی۔ لڑکے نے بتایا کہ سب کو پتا ہے میں فقیر خانے میں پڑی ہوں۔ بڑا محبتی بچہ تھا۔ مجھے دیکھا تو رونے لگا۔ اپنی جوتیاں مجھ کو دیے دے رہا تھا۔ مجھے بھی رونا آگیا۔ اس نے بتایا کہ میں وہاں سے بھاگ سکتی ہوں۔ کسی بھی موکھلے سے، جیسے موری کے راستے، نکل جاؤں۔ کہنے لگا باہر فقیر خانے سے کہیں اچھا ہے اور ذاکری میں کوئی برائی بھی نہیں۔

لیکن مجھ کو جواد آقا سے ڈر لگتا تھا۔ جانتی تھی کہ وہ اب بھی میری تاک میں ہے اور کہیں پکڑ پائے گا تو کھال ہی کھینچ لے گا۔ میں نے لڑکے سے کہہ دیا کہ اگر باہر نکلنے کو مل گیا تو تم کو دیکھنے تمھارے مدرسے آؤں گی۔

پھر وہ دونوں چلے گئے۔ دروازے والے بڈھے نے نان پیاز میں سے آدھی اپنے ڈب میں رکھی، آدھی مجھے تھمائی۔ میں رات کی بیٹھی صبح ہوتے تک دعائیں پڑھتی رہی۔ پوری بیاض کی دعائیں رٹی ہوئی تھیں، سب پڑھ ڈالیں۔ اجالا ہونے سے پہلے پہلے بقچہ اور شمائل اٹھا کر موری کے پاس پہنچی۔ لمبی لمبی لیٹ کر زمین پر گھسلتی ہوئی موری میں گھس گئی اور سینے کے بھل رینگنے لگی۔ ساری چادر کیچڑ میں لت پت ہوگئی، مگر میں باہر آگئی، جیسے سانپ اپنے بل سے نکلتا ہے۔ سامنے لمبی سنسان گلی تھی۔ میں دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی نان کھائی۔ فجر کی نماز پڑھی اور چل کھڑی ہوئی۔ گلی سے نکلتے ہی سورج نکل آیا اور مکان دکھائی دینے لگے۔

7

ایک ہفتے تک مجھے تپ چڑھی رہی۔ آواز بالکل بیٹھ گئی تھی۔ یہ بھی نہیں کہ روضہ خوانی کی ہو، نہیں، بس یوں ہی خاک دھول پھانکنے سے سینہ جکڑ گیا تھا۔ پت جھڑ کا زمانہ آتے ہی میرا سینہ جکڑ جاتا ہے۔ گئے دنوں میں ہمیشہ کھڑکیاں بند رکھتی تھی، اس سے یہ حالت نہیں ہوتی تھی۔ اب کھانسی آتی تو معلوم ہوتا تھا کوئی چیز گلے میں اٹک گئی ہے اور دم گھٹا جا رہا ہے۔ فقیر خانے سے نکلنے کے بعد لاٹھی بھی پاس نہیں تھی۔ دیواریں تھام کر چلتی، شمائل پیٹھ پر باندھ لی تھی۔ ہر طرف بھٹکتی پھرتی اور دروازے پر دستک دیتے ڈر لگتا تھا۔ صرف ایک بار سید عبداللہ کے بچوں کو دیکھا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی خالہ، رخشندہ کی بہن، مرگئی، اس کے سینے میں کچھ ہو گیا تھا، اسی میں ختم ہوگئی۔ اس کے بعد کوئی خبر، کسی کی سن گن نہیں ملی۔

ایک دن امینہ آغا کے گھر پہنچ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر پہنچی تو دھک سے رہ گئی۔ دیکھتی ہوں کہ سب اکٹھا ہیں۔ سب، بیٹے، پوتے، بیٹیاں، نواسے، نواسیاں۔ اور تو اور، سید اسداللہ، اس کے بچے اور عزیزہ، یہ سب بھی قم سے آگئے ہیں۔ سب کے سب جمگھٹا لگائے بیٹھے ہیں اور میری جمع پونجی کے حصے بخرے ہو رہے ہیں۔ میرا دل ایسا دھڑ دھڑ کرنے لگا کہ آگے بڑھا نہیں گیا، وہیں کی وہیں بیٹھ گئی۔ جواد آقا سید عبداللہ سے الجھا ہوا تھا۔ جھگڑا ایک قالین پر تھا۔ لڑکیاں بقچوں

پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ کوئی راضی نہیں ہوتا تھا۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ ہر چیز اسی کو ملے۔ امینہ آغا چیخ چیخ کر رو رہی تھیں کہ سب سے زیادہ تکلیف تو میں نے اٹھائی اور مجھی کو سب سے کم دیا جا رہا ہے۔

میں نے پیٹھ پر سے شمائل کھولی اور دیوار سے ٹکا کر بیٹھی رہی۔ میرے کانوں میں جانالی فاطمہ اور قمر کی آوازیں آئیں کہ کہہ رہی ہیں:

''اٹھو چلو، اٹھو چلو، سید خانم!''

اچانک کمال نے مجھے دیکھ لیا۔ زور سے چیخا۔ سب نے گھوم کر دیکھا اور آن کر مجھے گھیر لیا۔ جواد آقا کی آنکھیں چکر مکر کر رہی تھیں اور وہ چلا رہا تھا:

''دیکھ رہی ہو اپنی کرنی کا پھل؟ یہ جو تمھارے چیتھڑے گدڑے ہیں...''

میں کچھ نہیں بولی۔ ڈر لگ رہا تھا۔ قمر نے میرے کان میں کہا:

''اٹھو چلو، اٹھو چلو، سید خانم!''

ان سب کو پہلے تو شمائل نظر آئی۔ مبہوت ہو کر حضور کا روئے مبارک دیکھتے رہے۔ پھر مجھ سے کہنے لگے بقچہ کھولو، بقچہ کھولو۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ بقچہ تو کھولنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جانالی فاطمہ نے میرے کان میں کہا:

''سید خانم، جان! بس بہت ہو گیا۔ اب آ بھی جاؤ۔''

جواد آقا کہاں ماننے والا تھا۔ لات اٹھائے چلّا رہا تھا:

''اس کا بقچہ بھرا ہوا ہے!''

امینہ آغا کہہ رہی تھیں:

''بڑی خانم! بقچہ کھول بھی دیجیے نا، کہ ان کا کلیجا ٹھنڈا ہو۔''

جانالی فاطمہ کی آواز آئی:

''دکھا ہی دو۔ اٹھو، چلو۔''

میں نے بقچہ کھول دیا۔ پہلے سوکھی نانیں نکال کر دیوار کے پاس چن دیں۔ اس کے بعد کپڑا، لٹھے کا پارچہ، جو بقچے میں تھا اور سب اس کے لیے مرے جا رہے تھے وہ باہر نکال کر انھیں دکھا دیا اور کہا:

''ساڑھے تین میٹر۔ اتنے سے تو ہم آدمی ہیں، ہمارے لیے بہت ہے۔''
سب مجھے دیکھتے رہ گئے۔ پھر سب نے منھ دوسری طرف پھیر لیے۔ کمال، صفیہ کے بیٹے، نے رونا شروع کردیا۔

❊❊

(فارسی عنوان: ''فقیر'')

فریدون تنکابنی

چم پچچڑ

1

میرا باپ کوئی خاص پڑھا لکھا قابل آدمی نہیں تھا۔ زبان کے قواعد بھی ٹھیک سے نہیں جانتا تھا۔ البتہ فعل نہی سے خوب واقف تھا: نہ کرو''، ''نہ جاؤ''، ''نہ بولو''، اور اگر بس چلتا تو، ''سانس نہ لو۔''

میں چھوٹا تھا اس لیے وہ میرے پیچھے زیادہ پڑا رہتا تھا، لیکن یہ مجھ کو کچھ ایسا برا بھی نہیں لگتا تھا۔ میں سمجھتا تھا یہ اس کی پدری محبت ہے۔ سچ پوچھیے تو میں خود اس سے کچھ کچھ محبت کرتا تھا۔ لیکن جب میں ذرا بڑا ہوا اور اپنی مرضی پر چلنے کی خواہش کرنے لگا تو مجھے اس سے وحشت ہونے لگی۔ ہر قدم پر وہ میرے راستے میں آ کھڑا ہوتا، اس کی آنکھیں لال پیلی ہونے لگتیں، ہاتھ اوپر اٹھتا اور منھ کھل جاتا:

''نہ!''

وہ دن تو بھلائے نہیں بھولتا جب میں گلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا اور ہم سب اپنی دھن میں مست خوب ہلڑ مچا رہے تھے کہ میرا باپ نازل ہو گیا۔ وہ اچانک آن پہنچا تھا اور اس پر نظر پڑتے ہی میرے ہاتھ پاؤں ایسے پھولے کہ گھر بھاگ جانے کا بھی ہوش نہ رہا۔ اس نے مجھے دونوں کان پکڑ کر اٹھا لیا اور گھر کے اندر لے آیا۔ اسی طرح کانوں سے لٹکائے صحن پار کر کے اس نے مجھے کمرے کے گوشے میں پٹخ دیا۔ درد کے دو ستون میرے دھڑ کو تھامے ہوئے تھے اور مجھے جھکنے بھی نہیں دے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو دہکتی ہوئی سلاخیں کانوں کے راستے میرے بدن میں اتار دی گئی ہیں۔ ایک عذاب تھا۔ لیکن مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں تھی، اصل

عذاب وہ خفت تھی جو مجھے اٹھانا پڑی۔ مجھ کو معلق دیکھتے ہوے بچوں کی صورتیں ابھی تک میری نگاہوں میں پھر رہی تھیں: ان کی ہنسی، جو وہ روک رہے تھے، اور ترحم، جو وہ اپنی آنکھوں سے ظاہر کر رہے تھے۔

اسی دن سے میں تنہا ہو گیا۔ گھر کے کونے میں دیوار کے پیچھے سے مجھے بچوں کے چیخنے چلّانے، دوڑنے دھوپنے اور ہانپنے کی دور جاتی، قریب آتی آوازیں سنائی دیتیں اور میرا جی چاہتا لپک کر ان میں جا ملوں، لیکن کوشش نہیں کرتا تھا، باپ کے ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ میں بچوں سے جھینپنے لگا تھا۔ اب ان کے ساتھ مزہ نہ آتا، ہماری برابری جو ختم ہو گئی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ اب سے بچے میری ہنسی اڑایا کریں گے، اور انھیں اس کا حق بھی تھا۔

میرا باپ جب تک گھر میں رہتا اس کی زبان تالو سے نہ لگتی، مسلسل بولے جاتا تھا۔ کیا کیا پندونصائح، صداقت اور پارسائی کے کیا کیا درس ہوتے تھے۔ اس کی فصیح و بلیغ اور لفظی معنوی صنعتوں سے گراں بار تقریریں زیادہ تر دونوں وقت کے کھانے پر ہوتی تھیں۔ منھ میں کھانا ٹھنسا ہوا، اور ہر دو جملوں کے بیچ میں ایک لقمہ۔ اور ہم سب کو پہلے ہی سے معلوم رہتا کہ اب وہ کیا کہے گا، اس لیے ہم اس سے ایک دو جملہ آگے آگے چلتے اور انتظار کرتے تھے کہ وہ اپنی بات پوری کر کے ہماری چھٹی کرے۔ ہم پست ہو کر رہ جاتے تھے۔

تنخواہ ملتی تو وہ اسے آدھوں آدھ کر لیتا۔ آدھی اپنے ڈب میں رکھتا، آدھی میری ماں کو گھر کے خرچ کے لیے دیتا تھا۔ وہ ماں کو کبھی اپنی صحیح صحیح تنخواہ نہیں بتاتا تھا۔ میرا قیاس ہے کہ اس حصہ بانٹ سے پہلے ہی وہ کچھ رقم مار لیتا تھا، یعنی اپنے ساتھ بھی داؤں کر جاتا تھا۔ کیسی مزے کی بات ہے، ہے کہ نہیں؟ اس کی کچھ اوپری آمدنی بھی تھی جو ہم نے نہ تو کبھی دیکھی، نہ اس کا کچھ اتا پتا پایا۔ یہ ساری رقم وہ خود پھونک دیتا تھا۔ اسے جوئے کی لت جو تھی۔ پرانا جواری تھا۔ اگر کسی رات وہ اپنے آپے میں اور مگن ہوتا — اگر اس کے لیے مگن کی صفت استعمال کی جا سکتی ہو — تو ہم سمجھ جاتے کہ جیت کر آ رہا ہے۔ اس رات اس کی تقریروں کی فصاحت و بلاغت اور طوالت بہت بڑھ جاتی اور وہ ان میں ضرب الامثال بھی کھپانے کی کوشش کرتا، جیسے ''حق بہ حق دار رسید''، ''نابردہ رنج گنج میسر نمی شود''، ''راستی آور کہ شوی رستگار۔'' لیکن جب کسی رات وہ ہار جاتا اور تیوریاں

چڑھائے، یا ماں کے بقول ''کنکھنا کتا سا'' ہوتا تو اس کی تقریروں میں زہد و تقویٰ کی حکایتیں اور گندی دنیا کے گندے لوگوں کی شکایتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ کہتا تھا:

''جعل فریب زمانے بھر پر چھا گیا ہے۔ کسی کے پیٹ میں ایک آنت بھی سیدھی نہیں ہے۔ بس جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ!''

ایک رات وہ بہت دیر میں گھر لوٹا: سر اور چہرے پر خون، کپڑے تار تار۔ کہنے لگا، بس سے اتر رہا تھا کہ بس چل پڑی اور وہ اس کی جھپیٹ میں آ گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس رات دوسرے جواریوں نے اس کی بے ایمانی پکڑ لی تھی اور جم کر اس کی مرمت کی تھی۔

جب اس کے پاس پیسے ختم ہو جاتے تو سیدھے سبھاؤ ماں سے مانگتا نہیں تھا، چرا لیتا تھا۔ اور سب سے بدتر یہ کہ چوری ہم کو لگاتا تھا اور ایک فرض شناس باپ کی حیثیت سے ہمیں تنبیہ بھی کرتا تھا۔ مجھ کو اس کی اس حرکت کا یقین نہ آتا لیکن ایک دن اس نے مجھ کو بھی لے ڈالا۔ اس دن گھر میں وہ، ماں اور میں، صرف تین آدمی تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ گھر ہی میں اِدھر اُدھر ٹاپتا پھر رہا ہے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی پھیر میں ہے اور گھر سے باہر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ آخر موقع ملتے ہی میری آنکھ بچا کر وہ اپنی حرکت کر گذرا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کون سی حرکت۔ فقط یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا کام بن گیا ہے اور اب اسے کوئی پریشانی نہیں۔ جھٹ پٹ کپڑے بدل گھر سے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ماں مجھے ڈھونڈھتی ہوئی آئی:

''میرے بٹوے سے پیسے تم نے نکالے ہیں؟''

میرا منھ لال ہو گیا۔ بھانڈا پھوٹ گیا اور معما حل ہو گیا تھا۔ اس کے اس نیچ پن، ناقابلِ یقین نیچ پن پر خود مجھے شرم آ رہی تھی، اور اس پر بھی کہ ماں کو پتا چل جائے گا تو وہ کیسا خوار ہوگا۔ لیکن ماں نے میری اس خجالت، پریشانی اور بوکھلاہٹ کو، اور اس طرح ہکا بکا رہ جانے کو میرے مجرم ہونے کا ثبوت سمجھا۔ اس نے میری ساری جیبوں کی تلاشی لی، لیکن پیسے نہیں نکلے، نہ میرے پاس رقم چھپانے کا کوئی ٹھکانہ تھا، نہ میں گھر سے باہر گیا تھا کہ کہیں پیسے خرچ کر دیے ہوں۔ پھر وہ رقم اتنی بڑی تھی کہ میری عمر کا لڑکا اسے چرانے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا تھا۔

دوپہر کو میرا باپ گھر آیا تو ماں نے پیسے غائب ہوجانے کا ماجرا کہہ سنایا، اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں سمجھتی ہوں فلاں نے چرائے ہیں، اس کے سوا گھر میں کوئی تھا ہی نہیں۔ باپ اچانک بندوق کی گولی کی طرح مجھ پر آیا۔ گھونسے، لاتیں، تھپڑ مار مار کر اس نے میرا کچومر نکال دیا۔ مجھ کو اس کی فقط آواز سنائی دے رہی تھی کہ چیخ چیخ کر ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا:

''مجھے چوٹٹی اولاد نہیں چاہیے، مجھے چوٹٹی اولاد نہیں چاہیے۔''

❀

ہمارے گھر میں تفریح کا کوئی سامان نہ تھا۔ باپ ہم کو نہ سیر کرانے لے جاتا، نہ سنیما دکھانے۔ ہمارے یہاں نہ ریڈیو تھا نہ ٹیلی ویژن۔ وہ کہتا تھا یہ سب تباہ اور گمراہ کرنے والی چیزیں ہیں اور ان سے دین ایمان خراب ہوتا ہے۔ کتابیں پڑھنے کی ہم کو اجازت نہیں تھی۔ پہلی ہی بار جب اس نے میرے ہاتھ میں کتاب دیکھی تو میری وہ درگت بنائی کہ اب مجھے کتاب کی صورت سے وحشت ہوتی ہے۔ وہی سی کتاب اس نے میرے سر پر اتنی بار رسید کی کہ تین ہفتے تک میں چوندھیایا رہا۔ اس رات اس نے ڈٹ کر پلاؤ اڑایا، لیکن میرے حلق سے نوالہ نہ اترا۔

اسی لیے میری عادت پڑگئی تھی کہ چپ چاپ کسی کونے میں بیٹھا رہتا اور سوچا کرتا۔ اس پر بھائی بہن مجھ کو ڈانٹتے پھٹکارتے تھے، ماں بھی خفا ہوتی تھی۔ واقعی سب سے زیادہ وہ میرے ہی پیچھے پڑا رہتا تھا، لیکن ان کو بھی کوئی چین سے تھوڑی بیٹھنے دیتا تھا، مگر یہ کہ وہ سب خود ہی اس سے دور دور رہتے تھے۔ دکھاوا تو یہ تھا کہ بھاگنا کیسا، اس کو بہت چاہتے ہیں، مگر میں جانتا تھا سب دل سے یہی چاہتے ہیں کہ اس کے تن پر سر نہ رہے۔ دو وقتہ کھانے پر وہ سب بڑے صبر اور سنجیدگی کے ساتھ اس کی اکتادینے والی، گھسی پٹی اور تاؤ دلانے والی بے سر پیر کی تقریریں سنتے، کبھی کبھی جھوٹی ہنسی ہنستے، سر ہلاتے اور اگر منھ میں نوالہ نہ ہوتا تو اس کی ہاں میں ہاں بھی ملاتے، لیکن اندر اندر ان کا خون کھولتا رہتا اور وہ دانت پیسا کرتے تھے۔

ماں کو اب اس کے لچھنوں کا پتا چل گیا تھا اور وہ سمجھنے لگی تھی کہ بٹوے سے پیسوں کا نکل جانا، یا گھر کے قیمتی سامان کا اٹھ جانا کس کی کارستانی ہے، لیکن وہ بھی چپ چاپ سب جھیل رہی

تھی اور گویا کسی معجزے کے انتظار میں تھی۔ ان لوگوں میں اتنی جرأت بھی نہ تھی کہ دل سے باپ کے مرنے کی تمنا کریں۔ فقط ان کا جی چاہتا تھا، بغیر اس کے کہ اس خواہش کا خیال لائیں، کہ باپ کسی معجزے کے اثر سے مرجائے اور انھیں چین سے بیٹھنے دے۔

میں باپ کی ڈانٹیں کھاتا تھا لیکن میں نے اس کا غور سے جائزہ بھی لیا۔ اس کے چہرے کی شکنوں، ہاتھوں کی جنبشوں سے، کبھی لپک جھپک کر، کبھی ڈھیلے قدموں چلنے سے آشنا ہوا تو وہ مجھ کو ایک مجبور، تہی دست اور کچلا ہوا سا آدمی نظر آیا۔ بیوی بچے اس کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر اسے باہر گلی میں پھینک سکتے تھے، اس کی گدی میں ہاتھ دے کر دروازے تک کھدیڑ سکتے تھے اور زبردستی اسے گھر سے نکال باہر کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا کرتے نہیں تھے، کر ہی نہیں سکتے تھے، اتنی ہمت جو نہیں تھی۔ سچ پوچھیے تو مجھ میں بھی اس کی ہمت نہ تھی، لیکن اتنا میں جانتا تھا کہ اگر وہ شروعات کر دیں تو مجھ میں بھی ہمت آجائے گی۔ میں اس سے بہت کم ڈرتا تھا اس لیے کہ میں اسے بہت زیادہ جانتا تھا۔ ان کے دلوں سے اس کا خوف نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ انھیں اس کو سمجھنے کے لیے تیار کروں۔ مگر مجھ کو ان سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اگر باپ کو پتا چل جاتا کہ اس کے پیٹھ پیچھے میں کیا کہتا پھر رہا ہوں تو ہم سب کی شامت آجاتی۔ ایک بار جب میں نے بڑی ہمت کر کے اشاروں کنایوں میں اپنے بھائی سے کچھ باتیں کیں تو اس نے متوحش ہو کر مجھے دیکھا اور کہنے لگا:

''پاگل ہو گئے ہو؟ کیسی باتیں سوچ رہے ہو!''

ہاں، ہم سب اس سے بے طرح ڈرتے تھے، اس سے بے طرح نفرت کرتے تھے۔

2

جب میں بڑا ہو گیا تو اس خیال سے کہ مجھ کو ڈر نہ لگا کرے، میں نے فیصلہ کر لیا کہ خود میں دوسروں کو ڈرایا کروں گا۔ یا سچ پوچھیے تو اس حرکت سے میرا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ یہ میرے لیے محض ایک قسم کی تفریح، ایک مزیدار مشغلہ تھا، لیکن آپ شاید اسے مردم آزاری کی چھپی ہوئی خواہش، یا کوئی انتقامی جذبہ، یا خالص بدنفسی سمجھیں، یا کمتری کے احساس سے چھٹکارا پانے کی

کوشش۔ جو چاہے سمجھ لیجیے، میرے لیے سب برابر ہے۔

خزاں اور سرما کے موسموں میں، جب فضا ابر آلود اور تاریک اور بند بندسی ہوتی، میرا یہ کھیل زیادہ مزہ دیتا۔ کپڑوں کے اوپر میں برساتی پہن لیتا اور اس کے کالر اوپر اٹھا کر چہرہ چھپا لیتا۔ کسی ایک آدمی کو چن لیتا، اس طرح کہ جو بھی راستے میں آجاتا میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا، تین قدم کا فاصلہ دے کر۔ وہ تیز چلتا تو میں بھی تیز چلتا. وہ رک جاتا تو میں بھی رک جاتا، وہ کسی گلی میں مڑتا، میں بھی مڑتا۔ اگر وہ کسی مکان کے اندر چلا جاتا تو میں مکان کے سامنے تھوڑی دور پر بجلی کے کھمبے یا کسی درخت کے تنے کی ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ کھڑکی سے منڈیا نکالتا اور دیکھتا کہ میں اب بھی وہاں موجود ہوں۔ اور میں ہمیشہ اناڑی پن سے، بناوٹی اناڑی پن سے، ایسا ظاہر کرنے کی کوشش کرتا گویا میں اس کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوں اور میرا سارا دھیان اپنی طرف ہے، اور اپنے کام کی طرف، جو پتہ نہیں کیا ہے۔

ایک بار تو ان میں سے ایک آدمی ایسا ڈرا کہ اس نے گھر بھر کو خبر کر دی اور چھوٹے بڑے سب کے سب کھڑکی سے جھانک جھانک کر مجھے دیکھنے لگے اور میں ایسا بن گیا جیسے مجھے کوئی نظر ہی نہ آرہا ہو۔ بس کبھی کبھی کنکھیوں سے ان کی جانب دیکھ لیتا تھا۔ آخر ان میں کا ایک ہمت کر کے باہر نکلا اور مجھ سے پوچھنے لگا:

''کہیے، کوئی کام ہے؟''

سچ پوچھیے تو میں ڈرا کہ بات بڑھ رہی ہے، لیکن میں بوکھلایا بالکل نہیں۔ سوچا انھیں دور رخے اور اوٹ پٹانگ جواب دیے جائیں۔ میں نے پوچھا:

''کیا مطلب؟''

وہ بولا:

''آپ اتنی دیر سے یہاں کھڑے جو ہیں۔''

میں نے ظاہری تعجب سے پوچھا:

''یہاں میرے کھڑے ہونے کی منادی ہے؟ یا میں آپ کا راستہ روک رہا ہوں؟''

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔

''نہیں نہیں، یوں ہی، میں نے سوچا شاید آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔''

میں نے جواب دیا۔

''بہت بہت شکریہ۔ جب ضرورت ہوگی آپ کو اطلاع کر دوں گا۔''

وہ برخوردار میرے اس جواب سے پیچک کر رہ گیا اور خوب ڈرا۔ ہنسی روکتے روکتے میں بے ہوش ہوا جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ ایک زوردار قہقہہ میری ساری سنجیدگی کا بھانڈا پھوڑ دے، لیکن یہ سوچ کر کہ اگر اس وقت مجھ سے ذرا بھی چوک ہوئی تو یہ لوگ اپنے تمام خرخشوں کا حساب وصول کر لیں گے، میں نے خود کو سنبھالا۔

جو آدمی مجھ سے بات کر رہا تھا وہ ڈرا ہوا تو بہت تھا لیکن اتنی آسانی سے ہار ماننے والا بھی نہیں تھا۔ اس نے پھر سوال کیا:

''کسی کا مکان ڈھونڈھ رہے ہیں؟''

''جی،'' میں نے کہا:

''کس کا؟''

''اسی گلی میں مکان ہے،'' میں بولا، ''مجھے معلوم ہے۔''

وہ بولا:

''مالک مکان کا راستہ دیکھ رہے ہیں؟''

میں نے یوں ہی کہہ دیا:

''جی نہیں، کچھ آنے والوں کا انتظار ہے۔''

میں نے دیکھا اس کا چہرہ فق ہو گیا اور وہ چونے کی طرح سفید پڑ گیا۔ پھر وہ کچھ نہیں بولا، چپ چاپ گھر کے اندر چلا گیا۔

اندھیرا ہو گیا تو میں نے اپنا راستہ لیا۔ تھک گیا تھا، لیکن جیسے ہی اس آدمی کا خیال آتا ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ بیچارے! رات بھر جاگتے رہے ہوں گے۔

ایسے ایسے بہت قصے ہیں۔ سب سنا کر آپ کا دماغ پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ بس ایک واقعہ جو سب سے زیادہ طویل اور مزے کا ہے— اور آخری بھی— بیان کرتا ہوں۔ اور وہ واقعہ

ہے جس نے میری ان ساری حرکتوں کی مزدوری میرے ہاتھ پر رکھ دی اور اس پُرلطف مگر خطرناک کھیل سے میرے باز آنے کا سبب بنا۔

مغرب کا وقت ہوگا کہ میں بس سے اترا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ڈوبتے ہوئے سورج کی مدھم روشنی بھی ان سے نہیں چھن رہی تھی۔ بارش ہوچکی تھی اور زمین پر کیچڑ تھی، لیکن اس وقت پانی تھما ہوا تھا۔ میرے آگے ایک شخص بہت سج سج قدم رکھتا ہوا چل رہا تھا تاکہ کیچڑ کے چھپاکے اس کے کپڑے نہ خراب کریں۔ معلوم نہیں کیوں میری بدذاتی نے زور کیا اور میں نے اس کو دق کرنے کی ٹھان لی۔ وہ اچھی شخصیت کا خوش پوشاک آدمی تھا۔ جوان ہی تھا، پینتیس چالیس کے لگ بھگ عمر، ہٹا کٹا، گوری رنگت، منڈا ہوا چہرہ، سر پر بال مگر چندیا صاف۔ قریب تھا کہ میں اس سے آگے نکل جاؤں، لیکن میں نے اپنی رفتار دھیمی کردی، برساتی کے کالر اوپر اٹھائے، ٹھوڑی ان میں چھپالی اور سر کو اس طرح جھکالیا کہ بھنوؤں کے نیچے سے اسے دیکھتا رہوں۔

آخر وہ مردک میری طرف متوجہ ہوا۔ پہلے اس نے کچھ زیادہ خیال نہیں کیا، لیکن چند قدم اور چلنے کے بعد وہ سمجھ گیا کہ میں اس کا پیچھا کررہا ہوں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ میں نے سیدھے اس کی آنکھوں میں دیکھا لیکن پھر نظریں ہٹالیں اور ایسا ظاہر کیا کہ موٹروں کو دیکھ رہا ہوں۔ اس نے اپنی رفتار تیز کردی جیسے کسی ناگوار چیز کو جھٹکنا چاہتا ہو۔ وہ بس اڈے پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ ٹکٹ خریدا اور کھڑا رہا۔ میں نے بھی ٹکٹ لے لیا اور اس کے ایک دو آدمی پیچھے کھڑا ہوگیا۔ اب میں نے گردن بڑھا بڑھا کر اس کو اس طرح دیکھنا شروع کیا کہ آخر وہ پھر میری طرف متوجہ ہوگیا۔ بس آئی۔ ہم دونوں سوار ہوگئے۔ میں اس کے پیچھے بیٹھا۔ اب جب میں اس کو نظر نہیں آرہا تھا تب بھی وہ پریشان تھا۔ جانتا تھا کہ میں اس کا تعاقب کررہا ہوں لیکن اس سے کچھ بنائے نہیں بن رہی تھی۔ چند اسٹاپوں کے بعد وہ اتر گیا۔ پتا نہیں اسے وہیں اترنا تھا یا مصلحتاً اتر پڑا تھا۔ بس سے اترتے وقت اس نے مجھ کو ڈری ڈری نظروں سے دیکھا۔ میں نے ظاہر کیا کہ سڑک کی سیر دیکھ رہا ہوں اور اس اسٹاپ پر اترنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں نے سوچا اسے کچھ اطمینان ہوجائے، ذرا خود کو بہلا لے اور چین کی چند سانسیں لے لے تاکہ دوبارہ مجھ کو دیکھنا اسے اور بھی

کھلے۔ اسی میں تو مزہ تھا۔

جیسے ہی وہ آگے بڑھا میں جھٹ سے اٹھا اور اس کے پیچھے لگ لیا۔ وہ سڑک پار کر کے رکا، پھر مڑ کر دیکھنے لگا۔ میں گاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ ٹھیک اس وقت جب وہ مطمئن ہو کر مزے مزے چلا جا رہا تھا، اسے اپنے پیچھے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے بے یقینی کے ساتھ گردن گھمائی اور مجھے دیکھا کہ تین قدم کے فاصلے پر بظاہر اپنی دھن میں مست اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہوں۔ اس نے قدم بڑھائے۔ میں نے بھی قدم بڑھائے۔ وہ رکا اور اپنے جوتوں کی ڈوریاں کھول کر پھر سے باندھنے لگا۔ میں نے ایک سگریٹ نکالی اور ماچس جلانے کے بہانے وہیں ٹھہر گیا۔ یکبارگی وہ ایک جنرل مرچنٹ کی دکان میں گھس گیا۔ میں وہیں ایک طرف کھڑے ہو کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کر سکتا تھا، لیکن اسے زیادہ ستانا چاہتا تھا اس لیے خود بھی دکان کے اندر چلا گیا۔

''ذرا سنیے گا،'' میں نے کہا۔

وہ بھڑک کر پلٹا، سمجھا میں اس سے کچھ کہہ رہا ہوں، لیکن میں دکاندار کی طرف متوجہ تھا۔

''آپ کے یہاں فون ہوگا؟''

''جی نہیں،'' دکاندار نے جواب دیا۔

''آس پاس بھی کہیں نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہے کیوں نہیں،'' دکاندار بولا، ''یہ کیا چوراہے پر، ذرا آگے بڑھ کر۔''

پھر دکاندار نے ایک بڑی سی گڑیا اس کے سامنے رکھ دی اور پوچھا:

''یہ ٹھیک رہے گی؟''

''ہاں ہاں، بس یہی ٹھیک ہے،'' اس نے بوکھلاہٹ میں جواب دیا، ''کتنے کی؟''

''پچپن تومان۔''

میں باہر نکل آیا۔ برساتی کے کالر کے پیچھے میں اپنی ہنسی چھپائے ہوئے تھا۔ آج اس کی بچی 'پاپا' کی اس غیر معمولی مہربانی کا سبب نہ سمجھ پائے گی۔ وہ مجھ کو شاید یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ ایک تین چار سال کی بچی کا باپ ہے۔

میں ٹیلیفون بوتھ کے اندر چلا گیا۔ رسیور اٹھا کر میں نے یوں ہی کچھ نمبر گھمائے اور ایسا ظاہر کیا کہ کسی سے بات کر رہا ہوں۔ وہ بغل میں بنڈل دبائے دکان سے باہر نکلا۔ اس نے کنکھیوں سے بوتھ کی طرف دیکھا اور مجھے گفتگو میں مشغول دیکھ کر خوش بھی ہوا، وحشت زدہ بھی، اور دوسری سمت روانہ ہو گیا۔ میں نے رسیور کو رکھ دیا اور اس کے پیچھے چل کھڑا ہوا۔ میں نے اپنی رفتار بڑھائی یہاں تک کہ میرے اس کے درمیان تین قدم کا فاصلہ رہ گیا۔

پانی پھر برسنا شروع ہو گیا تھا۔ ذرا ہی دیر میں ہم دونوں بھیگے ہوئے چوہے ہو گئے۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ سڑک پر کھمبوں کے بلب اور گاڑیوں کے ہیڈ لیمپ روشن ہو گئے تھے۔ اچانک وہ ایک گلی میں مڑا اور بھاگنے لگا۔ پیچھے پیچھے میں بھی۔ لیکن میں نے اس کا خیال رکھا کہ ہمارا درمیانی فاصلہ زیادہ رہے اور وہ کسی دوسری گلی میں مڑ جائے۔ وہ مڑا اور میں اس موڑ کو چھوڑتا ہوا آگے بڑھا اور ایک مکان کے چھتے میں چھپ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

دس منٹ گذر گئے۔ وہ برآمد نہیں ہوا۔ میں نے پانچ منٹ اور انتظار کیا۔ اب میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ چھوڑوں اور اپنا راستہ پکڑوں کہ وہ گلی کے نکڑ پر دکھائی دیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھا، گلی کے اس سرے سے اس سرے تک، درختوں اور بجلی کے کھمبوں کے پیچھے۔ جب دیکھا کوئی نہیں ہے تو لپکتا ہوا، مگر آہٹ کیے بغیر، باہر آیا اور اس گلی سے ذرا ہٹ کر مقابل کی ایک اور گلی میں گھس گیا۔ یہ والی گلی آگے بند نہیں تھی اس لیے میں بھی آہٹ کیے بغیر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ تین قدم کا فاصلہ رہ گیا تو میں نے زمین پر اپنے جوتے کو رگڑ دیا۔

وہ یوں اچھلا جیسے گولی لگ گئی ہو۔ میں اس کی حالت خوب سمجھ رہا تھا اور مزے لے رہا تھا۔ اس کے دانت کٹ کٹ بول رہے تھے، ہاتھ چلچلا رہے تھے۔ بس نہیں تھا کہ میری بوٹیاں اڑا دے۔ عین مین اس آدمی کی سی حالت تھی جسے ملک الموت دکھائی دے گیا ہو۔ بالکل حواس باختہ تھا۔ اگر وہ وہیں زمین پر بیٹھ کر بھوں بھوں رونا شروع کر دیتا تو مجھ کو تعجب نہ ہوتا۔ اگر ایک دم جھپٹ پڑتا اور مجھ کو دیوار سے لگا کر میرا گلا گھونٹنے لگتا تو بھی مجھے تعجب نہ ہوتا۔ اسی لیے جب وہ ٹھہر کر میری طرف مڑا تو میں نے رک کر اپنا داہنا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال دیا۔ چال

کامیاب رہی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے رومال نکالا اور زور زور سے ناک صاف کرنے لگا۔ اب مجھ کو اس سے آگے بڑھ جانا پڑا۔ لیکن مجھے بالکل پسند نہیں تھا کہ وہ میرے پیچھے رہے، اس لیے کچھ آگے بڑھ کے میں نے پھر رک کر سگریٹ اور ماچس نکالی۔ اب وہ پھر میرے آگے آگے چلنے پر مجبور ہو گیا۔

گلی ختم ہوئی اور ہم ایک چلتی ہوئی روشن سڑک پر نکلے۔ اس نے بھیڑ میں مل جانے کی کوشش کی، لیکن وہ خود سمجھتا تھا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ اب، جیسے اچانک کوئی نئی بات ذہن میں آگئی ہو، اس نے سڑک کے کنارے جا کر ٹیکسی کو آواز دی۔ خوش قسمتی سے پہلی ٹیکسی بھری ہوئی نکلی اور اس سے مجھے موقع مل گیا کہ کچھ پرے جا کر اس طرح کھڑا ہو جاؤں کہ اس کی نظر مجھ پر نہ پڑے، اور وہ بھی فرار کے منصوبے میں کچھ ایسا محو تھا کہ یا تو مجھ کو بھول ہی گیا تھا یا میری طرف دھیان نہیں دے سکا تھا۔ وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور ٹیکسی چل دی۔ جیسے یہ وہ میرے سامنے سے گذرنے لگی میں نے ہاتھ اٹھا دیا۔ ٹیکسی رک گئی۔ ڈرائیور نے پوچھا:

''کہاں جایئے گا؟''

''میں نے روا روی میں پوچھا:

''یہ بھائی صاحب کہاں جا رہے ہیں؟''

اور وہ احمق ڈرائیور! اگر اس کی سواری پیچھے سے اس کے ایک دھپ رسید کرتی تو میں اسے برحق گرداننا۔ ڈریور نے مجھے بتا دیا۔ بتا دیا کہ وہ دکھیا کہاں جا رہا ہے، اور میں نے دروازہ کھولا اور بے پروائی کے ساتھ کہا:

''اتفاق سے مجھے بھی اُدھر ہی جانا ہے۔''

دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا:

''اجازت ہو تو...''

وہ بولا:

''کوئی بات نہیں۔''

یہ 'کوئی بات نہیں' ہزار مغلظات سے بدتر بات تھی، اور اس کا لہجہ کیا تھا گویا بدزبانی،

ناچاری اور غیظ وغضب کا ملغوبہ تھا۔

میں جان بوجھ کے ذرا ترچھا ہو کر بیٹھا تھا، اس طرح کہ میری پیٹھ دروازے کی طرف اور آدھا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ ڈرائیور بولے جا رہا تھا لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہ سن رہا تھا، نہ جواب دے رہا تھا۔ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ میرے ہمراہی کو کسی مخصوص جگہ جانا نہیں ہے، جیسے مجھے نہیں جانا تھا، لیکن آخر تھک ہار کر اس نے ٹیکسی رکوالی۔ جب تک وہ ڈرائیور سے بقیہ پیسے واپس لے، میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ اور اب وہ اپنے آپ کو مجھ سے چھٹکارا ملنے کا یقین دلا رہا تھا۔ اور مجھے بھی اس کا یہ خیال کرنا برا نہیں لگا۔ ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے شاید بلا ٹلنے کے شکرانے میں، یا شاید رشوت کے طور پر، مجھے خدا حافظ کہا اور بولا:

''بہت مہربانی، شکریہ۔''

میں نے بھی کہا:

''اچھا بھائی صاحب، خدا حافظ۔''

پھر میں نے جلدی سے ڈرائیور سے کہا:

''مجھ کو ذرا آگے بڑھ کر اترنا تھا، مگر خیر، تمھاری چھٹی۔ میں یہیں اتر، جاتا ہوں۔ یہ لو۔''

وہ ایک پاؤں زمین پر رکھ چکا تھا اور دوسرا رکھنے کو تھا کہ اس نے میری بات سن لی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ دم بھر کو سناٹے میں آ گیا۔ اس کا ہاتھ ہینڈل پر دھرا اور پاؤں اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ ٹیکسی کا دروازہ دھڑاک سے بند کیا اور تیزی سے چل دیا۔ اسے امید تھی کہ میں بھی بقیہ کے چکر میں کچھ دیر پھنسا رہوں گا۔ مگر میں نے کھلے پیسے دیے تھے اس لیے مجھ کو رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں اترا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔

راستے میں پہلی گلی پڑتے ہی وہ اس میں مڑ گیا، اور اتفاق کی بات کہ اس نے بری جگہ نہیں چنی تھی۔ گلی تاریک تھی اور اس میں درخت بھی تھے۔ وہاں کے بلبوں میں سے ایک تو ٹوٹا ہی ہوا تھا، اور جو جل رہے تھے ان کی بھی روشنی درختوں کے گھن میں کھوی گئی تھی۔ وہ درختوں کے درمیان تیزی کے ساتھ اِدھر اُدھر لہراتا ہوا چلا جا رہا تھا تاکہ میں اسے دیکھ نہ سکوں اور اس کا

سراغ گم کردوں۔ اور واقعی قریب تھا کہ وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے، اور اسی لیے میں نے احتیاط کا دامن چھوڑا اور آگے بڑھ آیا۔ کئی بار وہ درختوں میں سے نکلتا نظر آیا، اور اب اس کا کہیں پتا نہ تھا۔

درختوں کے سامنے ایک تاریک بند گلی تھی۔ اس کے خاتمے پر ایک لیمپ زمین پر روشنی کا فقط ایک دھبا ڈال رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ درختوں ہی میں چھپا ہوا ہے یا اس گلی کے اندر کہیں ہے۔ میں نے احتیاط سے درختوں کے ارد گرد دیکھا۔ نہیں تھا۔ یقیناً گلی کے اندر تھا۔ میں گلی میں بڑھتا چلا گیا، لیکن سچی بات ہے مجھ پر کچھ کچھ خوف طاری ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا سراغ کھو دیا تھا اور یہی بات مجھے ڈرا رہی تھی۔ میں نے رک کر گلی کے اُس سرے پر نظریں گاڑ دیں۔ مجھے پتا تھا وہ وہیں کہیں ہے، لیکن میں جاننا چاہتا تھا کس جگہ پر۔

اچانک زمین پر کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ گلی کے اس سرے پر لیمپ کے روشن دھبے کے نیچے میں نے دیکھا کہ گڑیا کا ڈبا زمین پر پڑا ہوا ہے۔ اور وہ بے چارہ! یقیناً بھاگنے کی ہڑ بڑاہٹ میں وہ نالے کے اندر جا پڑا تھا، یا اس کا پیر کسی چیز میں الجھ گیا تھا اور وہ بھی وہیں کہیں زمین پر ڈھیر تھا۔ یقین کیجیے، اب مجھے اس کے حال پر افسوس اور اپنے کیے پر پچھتاوا ہونے لگا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ چاہتا تھا اس سے معافی مانگوں اور اس کی کچھ مدد کروں۔ احتیاط چھوڑ چھاڑ میں روشنی کے اس دھبے کی طرف دوڑا۔ میری نظریں گڑیا کے ڈبے پر جمی ہوئی تھیں۔

اور وہ اسی گھات میں تھا۔ ابھی میں گلی کے سرے تک پہنچا بھی نہ تھا کہ وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا، پیچھے سے۔ پتا چلا دَم دار آدمی ہے اور خاصا منجھا ہوا۔ پہلے تو اس نے بائیں ہاتھ سے میرا منھ دبا لیا، پھر دوسرے ہاتھ سے میرا داہنا ہاتھ جکڑ لیا۔ بھولا بیچارہ! میری وہ بھبکی اسے اب تک بھولی نہ تھی۔ اور اس نے میرے ہی ہاتھ سے میرے پیٹ کو کوٹ کر رکھ دیا۔ میری سانس رک رک گئی اور میں تکلیف سے دوہرا ہو گیا۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ شاید سمجھ گیا تھا کہ اب میں اس کا کچھ نہیں کرسکتا۔ اور میری پیٹھ پر چار پانچ گھونسے جما دیے۔ وہ میری ہڈی پسلی ایک کیے دے رہا تھا۔ میں بھی خوب سمجھ رہا تھا کہ اتنی دیر سے جمع ہوتا ہوا بخار ہے جس نے اس کے گھونسوں میں یہ زور بھر دیا ہے۔

آخر اس نے میرے منھ پر سے ہاتھ ہٹالیا اور ایک کراری لات رسید کر کے مجھے کیچڑ میں رگید دیا۔ میں منھ کے بھل کیچڑ میں جا رہا اور میرا ہاتھ کسی چیز پر پڑا۔ گڑیا کا ڈبا تھا۔ میں نے ایک لوٹ لگائی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ سے اپنے چہرے پر کی خون آلود کیچڑ پونچھی، دوسرے ہاتھ سے گڑیا کو مڑے تڑے ڈبے میں سے نکال کر اپنے قبضے میں کیا۔

اس کے بھاگتے قدموں کی دور ہوتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میرے حواس واپس آئے۔ اب جا کر میری سمجھ میں آیا کہ اس نے مجھ پر کیا ستم توڑا ہے اور یہ بھی کہ میں نے اس پر کیا ستم توڑے تھے۔ میں نے گڑیا کو بغل میں دبایا اور قہقہے مار مار کر ہنسنے لگا۔ دل کھول کر ہنسا، اتنا ہنسا، اتنا ہنسا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ معلوم نہیں کتنی دیر، آدھے گھنٹے، ایک گھنٹے تک، یہی ہوتا رہا کہ میرے قہقہے تھمتے مگر پھر اس کا خیال، اپنا خیال، گڑیا کا خیال آ جاتا اور مجھ پر پھر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا، سب سے زیادہ اس گڑیا کے خیال سے۔

وہ اب تک میرے پاس ہے۔ میں نے اسے یادگار کے طور پر رکھ چھوڑا ہے۔ پیاری سی گڑیا ہے۔

❊❊

(فارسی عنوان: ''کنہ'')

فریدہ رازی

بلی کا خون

اب میں اپنی بلی کے بدن پر نظر کرتی ہوں۔ کیسا سوکھ کر رہ گیا ہے! یہ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں، وہ مرگئی، ہم دونوں کو چین پڑا۔

کب سے وہ اپاہجوں کی طرح گھسٹ رہی تھی۔ اس کی میاؤں میاؤں سے پتا چلتا تھا کہ دکھ جھیل رہی ہے مگر ظاہر نہیں کرتی۔ اس کی گھٹی گھٹی پتلی آواز میں فریاد کی کیفیت آگئی تھی۔ وہ سارے وقت کسی کونے میں سکڑی پڑی رہتی اور مچی مچی آنکھوں سے میری طرف دیکھا کرتی تھی۔ اس کی نگاہیں، غصے میں بھری ٹٹولتی ہوئی نگاہیں، میری ہڈیوں کے گودے تک کو جلائے ڈال رہی تھیں۔

روز بروز وہ کمزور اور دبلی ہوتی جا رہی تھی۔ بال اس کے سوکھے ہوئے بدن پر چپک کر رہ گئے تھے اور ان کی آب جاتی رہی تھی۔ وہی بلی جو پرچھائیں بھی دیکھ پاتی تو چیتے کی طرح جست مارتی اور ایسا پھنکارتی کہ مجھ کو خوف آنے لگتا، اب ایسی بے جان ہوگئی تھی کہ میں اسے جتنا بھی چھیڑتی، وہ شل پڑی رہتی یا میری طرف توجہ کیے بغیر اٹھ کر کسی اور گوشے میں پڑ رہتی۔

اس سے پہلے وہ مگن مست رہتی تھی۔ قالین پر لمبی لمبی لیٹ جاتی، نرم سفید سینہ ابھار ابھار کر بند پنجوں سے مجھ کو نوچتی تھی۔ چاہتی تھی میں اس کو گدگداؤں، اس کا سینہ کھجاؤں اور وہ خرخرانا شروع کر دے۔ آنکھیں نشیلی بنا کر میرے پیچھے پڑ جاتی کہ اس کے ساتھ کھیلوں۔ جب وہ ٹھیک تھی تو صوفے کے ایک کنارے پھیل کر لیٹ جاتی اور خراٹے بھرا کرتی تھی۔ اس زمانے میں اس کے گدبدے جسم پر پھولے پھولے بال چمک مارتے تھے۔

اس کے گول منہ اور صاف ستھری مونچھوں سے خوشی برستی تھی، لیکن اب اسے دیکھ رہی ہوں تو جی متلا رہا ہے۔ وہ گھل کر رہ گئی تھی۔ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ میں اسے بہلانے کے لاکھ جتن کرتی، کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کا کچھ دل ہی نہ چاہتا تھا۔ بس مجھے دیکھ کر رہ جاتی تھی۔ نہ کھانا پینا، نہ گھومنا پھرنا، نہ کھیلنا کودنا، کچھ نہیں۔

یہ سب گذشتہ سال بہار کے موسم میں شروع ہوا۔ کئی دن سے ایک سرمئی بلا منڈیر پر آکر میاؤں میاؤں کیا کرتا تھا، اور میری بلی کے کان پھڑکنے لگتے، بدن تن جاتا اور وہ لپک کر کھڑکی کے پاس پہنچ جاتی۔ میں دروازے بند رکھا کرتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ باہر نکل جائے، پھر بچوں کا جھول چھوڑ دے تو میری مصیبت ہو جائے۔ لیکن ایک دن جو میں گھر لوٹی تو وہ غائب تھی۔ میں نے سب جگہ ڈھونڈھا، کہیں نہیں ملی۔ کئی دن بعد کھڑکی کے باہر اس کی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ جست مار کر اندر آگئی اور مجھ کو نظرانداز کرتی ہوئی سیدھی باورچی خانے میں گھس گئی۔ معلوم ہوتا تھا بہت بھوکی ہے۔

وہ دبلی ہو گئی تھی مگر چاق چوبند تھی۔ ہر چیز کے گرد گھومتی، جو پاتی کھا لیتی اور کسی گوشے میں پڑ کر سو رہتی۔ کچھ دن تک مجھ سے کھنچی کھنچی رہی لیکن رفتہ رفتہ اس کی پرانی عادتیں لوٹ آئیں۔ اب وہ مجھ سے کبھی کبھار کھیلنے لگی۔ صبح صبح میرے بستر پر آجاتی اور میرے چہرے پر آہستہ آہستہ مٹھی مار کر مجھے جگا دیتی۔

یہاں تک کہ ایک دن پھر اسی سرمئی بلے کی آواز سنائی دی۔ میری بلی کی آنکھیں چمکنے لگیں، بال کھڑے ہو گئے۔ اس نے انگڑائی سی لی اور اپنی جگہ پر چکر کاٹنے لگی۔ پھر دونوں نے کھڑکی کے شیشے کے آر پار سے کھیلنا شروع کیا۔ سرمئی بلے کی سبز پیلی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے پھولے پھولے نرم بال تھے اور چھوٹا سا گول منہ بھلا لگتا تھا۔ دونوں دیر تک اپنے کھیل میں مست ایک دوسرے کو گھورتے، میاؤں میاؤں کرتے، غراتے رہے، پھر تھک کر کھڑکی کے قریب پڑ رہے اور آہستہ آہستہ دمیں ہلانے لگے۔

آخر میری بلی سے نہ رہا گیا، دھیرے دھیرے، چلتی ہوئی میرے پاس آئی، کود کر میرے زانو پر بیٹھ گئی، چاپلوسی شروع کر دی۔ اس کی جو جو ادائیں مجھے پسند تھیں، سب اس نے

دکھائیں۔ سرمیری گردن سے رگڑا، آنکھیں میچ کر زمین پر لوٹیں لگائیں، لیکن میں ذرا بھی نہ پسیجی کیونکہ میں خوب سمجھ رہی تھی وہ کیا چاہتی ہے۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اچانک وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی اور میرے سامنے کھڑے ہوکر پھنکارنے لگی۔

سرمئی بلا دیر تک کھڑکی کے پیچھے میاؤں میاؤں کرتا رہا، آخر وہاں سے چلا گیا، لیکن میری بلی صبح تک کھڑکی کے سامنے بیٹھی رہی۔

میں نے سوچا کوئی بات نہیں، کچھ دن میں بھول بھال جائے گی اور وہ بھی اپنے گھر لوٹ جائے گا، لیکن ایک رات جب میں گھر آئی تو دیکھا سرمئی بلا کھڑکی کے پیچھے بیٹھا ہے اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ مجھے تاؤ آ گیا، ڈپٹ کر اس کی طرف لپکی اور وہ بھاگ گیا۔ میری بلی نے ناچ ناچ کر میاؤں میاؤں کرنا شروع کر دیا، پھر پنجوں سے دروازہ کھرچنے لگی۔ میں اسے چھوڑ کر اپنے کام میں لگ گئی۔ کئی دن تک میں نے نگرانی رکھی کہ دروازہ بند رہے اور وہ بھاگنے نہ پائے۔ میری یہی مرضی تھی۔ وہ میری بلی تھی۔

ایک دن پھر شام کے وقت سرمئی بلا احاطے میں نظر آیا۔ میں بھنا کر رہ گئی۔ لکڑی اٹھا کر میں نے احاطے بھر میں اس کو رپٹایا اور مار مار کر باہر نکال دیا۔ واپس آئی تو میری بلی چیتے کی طرح میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔ میں جدھر بھی مڑتی وہ اچھل کر اُدھر آ جاتی۔ بری طرح بھڑ کی ہوئی تھی۔ اس کی انگارے برساتی ہوئی آنکھیں پھیل کر دگنی ہوگئی تھیں، ستا ہوا منھ بھیانک ہو رہا تھا۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی سبھی ترکیبیں آزما ڈالیں لیکن وہ اپنے آپے میں نہیں تھی۔ آخر وہ مجھ پر جھپٹ پڑی۔ میری گردن میں لپٹ کر اس نے اپنے نکیلے دانت میرے چہرے میں اتار دیے۔ میری سانس رکی جا رہی تھی۔ میں خوفزدہ ہو کر چیخنے لگی، یہاں تک کہ کسی نے مدد کو آ کر اسے ہٹایا۔ میں نے برے حالوں کمرے کے اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ میری بلی نے بغاوت کر دی تھی، میرے خلاف اور میرے ظلم کے خلاف۔

صبح تک وہ راہداری میں روتی پھری۔ میں نے اسے نکلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے بعد سے وہ روزانہ رات رات بھر کھڑکی سے لگی بیٹھی رہتی، مگر سرمئی بلے کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں نے اس کے لیے بہترین کھانے تیار کیے، جو جو اسے بھاتا تھا سب دیا، لیکن اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں

لگایا۔ میں اس کے جتنے لاڈ کرتی اتنی ہی وہ ضدی اور چڑ چڑی ہوتی گئی۔ میں نے اسے کھلی چھوٹ دے دی کہ جن جگہوں پر اس کو پاؤں دھرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی وہاں جا کر سوئے، لیکن وہ روز بروز نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن پڑوس کے کوٹھے پر کسی بلی کی آواز سن کر وہی میری بلی جو بمشکل خود کو ایک سے دوسرے کمرے تک گھسیٹ کر لے جاتی تھی اور جس کے اندر کچھ نہیں رہ گیا تھا، اچانک اس طرح چھلانگ مار کر کھڑکی سے باہر کودی کہ ٹانگ توڑ بیٹھی اور فریادیوں کی طرح گلی میں رونے لگی۔ میں اسے گھر میں اٹھا لائی۔ بہت دن میں جا کر ٹھیک ہوئی لیکن لنگڑانے لگی۔ کوشش بیکار تھی۔ وہ بدل چکی تھی اور اب میرا بھی حوصلہ جواب دینے لگا۔ اس کی سسکیوں، اس کی چیخوں، اس کی بدمزاجی، اس کی شکستہ حالی سے میرا ناک میں دم تھا۔ اس کا ایک کونے میں مرے ہوئے چوہے کی طرح پڑے رہنا مجھے دق کرائے دے رہا تھا۔ میں سمجھتی تھی، اچھی طرح سمجھتی تھی کہ وہ دکھ جھیل رہی ہے اور گھل رہی ہے۔ میں اس کے قریب جاتی تو اس کی آنکھیں پتھرا کر مندنے لگتیں۔ وہ سر اٹھاتی، کچھ دیر تک پلکیں جھپکاتی، پھر گردن ڈال دیتی اور سو جاتی۔

کل ایک بلی کی آواز سنائی دی۔ میں نے کھڑکی کھول دی کہ اس کا جی چاہے تو باہر چلی جائے۔ اس نے سر اٹھایا، کان ہلائے، مونچھیں سیدھی کیں اور کھڑکی کی جانب دیکھا۔ پھر اس کی تھکی تھکی بجھتی ہوئی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ اس نے کئی بار فریاد کے انداز میں میاؤں میاؤں کی آواز نکالی، دانت نکوسے اور دوبارہ سو گئی۔ اور آج میں نے اس کو مار ڈالا۔

❊❊

(فارسی عنوان: ''گربہ ام را کشتم'')

محسن دامادی

آقائے ماضی کے عجائب خواب

پھر ایک وحشت ناک خواب اور!

آقائے ماضی چیخ مار کر اچھل پڑے۔ انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے کمرے کی جانی پہچانی فضا دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ ہمیشہ کی طرح پانی کا جگ انھوں نے سرہانے رکھ چھوڑا تھا۔ ایک دو ٹھنڈے ٹھنڈے گھونٹ بھر کر ان کے حواس کچھ ٹھکانے آئے۔ وہ اٹھے اور لڑکھڑاتے ہوئے کھڑکی تک گئے۔ صبح بہار کی سرد ہوا بڑی رغبت کے ساتھ پھیپھڑوں میں بھری۔ تڑکے کی سفیدی پھیل چکی تھی۔ کئی گہری گہری سانسوں نے انھیں کسی قدر سکون بخشا۔ رات کے خوابوں سے ان کا سر گھوم رہا تھا۔ ایک سال سے زیادہ ہو گیا تھا کہ وہ دکھ جھیل رہے تھے، اور یہ انھوں نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ لیکن اس دن، صبح کی اس روح پرور فضا میں انھوں نے قسم کھا کر عہد کر لیا کہ پہلی فرصت میں کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کریں گے۔

دوسرے دن سہ پہر کو وہ ڈاکٹر آشنا کے سامنے بیٹھے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں۔ دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ماہر ڈاکٹر آشنا کو بھانت بھانت کے مریضوں سے نپٹنے کا خوب تجربہ تھا۔ اس نے آقائے ماضی کو اطمینان دلایا کہ وہ ان کی پتا گھنٹوں سن سکتا ہے، اور آقائے ماضی نے یوں بات شروع کی:

❁

میری بدبختی کی شروعات اس وقت سے ہوئی جب سے ان وحشت ناک خوابوں نے میرا پیچھا لیا اور کوڑھ کی طرح میری جان کو لگ گئے۔ ایسے خواب جنھیں دل دہلا دینے والے بھیانک

کابوسوں کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب، میں مٹا جا رہا ہوں۔ ایسی اذیت ناک اور قاتل موت مر رہا ہوں کہ خدا اپنے کسی بندے کو نصیب نہ کرے۔ میری روح تک روگی ہوگئی ہے، مرجھاتی چلی جا رہی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہوتا کیا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اتنے ہی بیان سے آپ کو میری تکلیف کی اصل معلوم ہوگئی ہوگی، پھر بھی کوشش کرتا ہوں کہ اس مرض کے اسباب کا پتا لگانے اور اس کا علاج نکالنے میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کروں۔ میں کوئی بے علم آدمی نہیں۔ اجازت ہو تو پہلے کچھ اپنے متعلق عرض کر دوں۔

میری تعلیم کا خصوصی میدان تاریخ ہے، گو میں نے لسانیات میں بھی ڈی لٹ کیا ہے۔ ایران کی قدیم تاریخ کے سلسلے میں میرے مطالعات اور سریانی اور سغدی زبانوں پر میری تحقیقات کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے میں نے ٹیلی ویژن پر خطِ میخی کے بارے میں پروگرام دیا تھا، پتا نہیں آپ نے ملاحظہ کیا کہ نہیں۔ میں نے اس میں کچھ نئے نظریات پیش کیے تھے۔ امید ہے اسے خود ستائی پر محمول نہ کیا جائے گا، عرض فقط یہ کرنا تھا کہ میں کوئی عامی نہیں ہوں۔ خوابوں کے بارے میں بھی بہت کچھ علم رکھتا ہوں۔ فرائڈ کی تعبیرِ خواب پر حاشیہ نویسی کے منصوبے کے علاوہ خوابوں کے موضوع پر ایک مستقل کتاب کا خاکہ بھی میرے ذہن میں بننا شروع ہوگیا ہے۔ یہ بغیر علمی اصطلاحوں کے عام فہم کتاب ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ خواب کبھی تو روزانہ کے یا گذرے ہوئے واقعات کی بازگشت ہوتے ہیں اور کبھی انسان کے اپنے تخیل کی پیداوار، لیکن اگر ایک سال سے زیادہ عرصے تک متواتر ہر رات عجیب و غریب اور نا قابلِ یقین خواب آپ کے تعاقب میں آتے رہیں، وہ بھی ایک مقررہ ترتیب کے ساتھ، تو قدرتی بات ہے کہ آپ کو اپنے بارے میں طرح طرح کے گمان ہونے لگیں گے۔ آپ کا دماغ پریشان نہیں کرنا چاہتا، معاف کیجیے گا، لیکن اس خیال سے کہ اپنے خاندان، بلکہ خاص اپنے گھرانے، کے بارے میں بھی کچھ عرض کروں۔ صرف اپنی پشتینی روایت کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔

میرے والدِ بزرگوار معتمد الماضی شاہ شہید کے قرابت دار تھے اور ایک ریاست کی

حکومت ان کے حوالے تھی۔ اسی طرح میرے دادا صاحب خواجہ پہلوان ماضی باشی کا آغا محمد خان قاجار کے دربار میں بڑا دبدبہ تھا۔ شاہی خاندان کے رکن اور شاہ کے سیاسی مشیر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے وقت کے پہلوان اور کشتی کے چیمپین بھی تھے۔ میرے اجداد پشت در پشت ایران کے درباروں میں بڑے مقام اور مرتبے کے حامل رہے ہیں۔ امن کے دنوں میں ان کی خوش انتظامی اور جنگ کے زمانے میں ان کی شجاعت اور جنگجوئی کی دھوم رہتی تھی اور معتبر تاریخی کتابوں میں اس کا تذکرہ ہوا ہے۔

جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے، میرے جدِاعلیٰ ہندوستان کی مہم میں نادرشاہ کے سپہ سالار تھے اور تاریخ میں ان کی دلاوری کا خصوصی بیان ملتا ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ دشمن تک ان کی بہادری اور دلیری سے چشم پوشی نہیں کر سکے۔ میرے ذاتی کتب خانے میں ایک تذکرہ موجود ہے، اس کے مطالعے اور دوسرے مستند ماخذوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تیس پشت پہلے میرے ایک بزرگ شہنشاہ داریوشِ اعظم کے خاص سنگتراش تھے اور سفر وحضر میں اس کے ساتھ رہتے تھے۔ میرا تاریخی اور وجدانی ادراک میرے پورے وجود پر محبت اور عقیدت کے وہی احساسات طاری کر دیتا ہے جو میرے ان بزرگ پر داریوش شاہِ اعظم کے کتبے کندہ کرتے وقت طاری رہتے ہوں گے۔ ذرا تصور فرمایئے، ارتشِ جاویداں کے سے لاؤلشکر کی خدمت، وہ بھی شہنشاہ داریوش کی ہم رکابی میں! کیا عرض کروں، زبان ساتھ نہیں دیتی۔ انھیں بزرگ کے دادا کا ذکر نہیں کروں گا کہ بعض مورخ کروشِ اعظم کے منشورِ حقوقِ انسانی کو ان سے منسوب کرتے ہیں۔

اور میں، ایسے بزرگوں کی ناخلف اولاد، اپنے خوابوں کی، جی ہاں ڈاکٹر صاحب، اپنے خوابوں کی فریاد لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں اس بودے پن پر میرے اجداد کے استخوان قبروں میں کانپ کانپ جاتے ہوں گے۔

البتہ ڈاکٹر صاحب، میری باتوں کو دراز بیانی سمجھ کر آپ انصاف نہ کریں گے۔ یہ باتیں آپ کے لیے اور ملتِ ایران کے لیے فخر کا سرمایہ ہیں۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ خودنمائی میرا مقصد نہیں۔ ایک متخصص کی حیثیت سے میں بھی خوب جانتا ہوں کہ کسی معاملے کے ہر پہلو سے اچھی طرح واقف ہوجانے کے بعد ہی اس کے سلسلے میں مناسب اقدام کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی

جانتا ہوں کہ آپ ان خوابوں کی تفصیل جاننے کو بے چین ہوں گے، اس لیے تمہید ختم کر کے اصل قصے پر آتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب، مختصراً عرض ہے کہ میرے خواب کچھ عجب کابوس ہیں جن کا تعلق گذشتہ تاریخ سے ہوتا ہے۔ آپ کو تعجب ہوا نا؟ لیکن ان کابوسوں کو اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ ایک سال کے ان سب خوابوں کو کابوس کہہ دینا بھی انصاف کی بات نہ ہوگی، اس لیے کہ شروع کے چھ ماہ تک تو میرے خواب ایسے شیریں اور لذت بخش ہوتے تھے کہ میں نہ صرف رات بھر مزے لیتا تھا بلکہ صبح کو بڑے جوش اور شوق کے ساتھ بستر سے اٹھتا تھا، خوب سینہ تان کر اور گردن اکڑا کر اور زور زور سے قدم رکھتا ہوا چلتا تھا جیسے کوئی جنگ جیت کر مفتوحہ زمین پر چل رہا ہوں۔ یہ سنہرے خواب بڑی بڑی جنگوں میں میری شجاعت اور سپہ گری کے منظر دکھاتے تھے۔

میں بادشاہ سلامت کے ندیموں میں ہوا کرتا تھا، ایسا ندیم کہ ان کے پہلو بہ پہلو بیٹھتا تھا۔ بادشاہ سلامت کے بارے میں بھی بتا دوں۔ وہ زرِ سرخ کے بڑے سے تخت پر جلوہ افروز ہوتے تھے جس کے دونوں طلائی زینے ہیرے اور موتیوں سے آراستہ تھے۔ دیبائے رومی کے گاؤتکیوں سے ٹیک لگائے، الماس، زمرّد اور فیروزے کی انگشتریوں سے مزین دستِ مبارک زانو پر دھرے، جواہر سے مکلّل لباسِ فاخرہ جو ان کے شاہانہ پیکر پر خوب پھبتا تھا، گردنِ عالی میں زمردوں سے مرصع طوق اپنی بہار دکھاتا ہوا۔ تاجِ شاہی کی بابت کہنے کو تو بہت کچھ ہے مگر بس ایک خواب کا ماجرا سن لیجیے۔

میں نے بادشاہ سلامت کو دیکھا کہ بڑا بھاری مطلاّ تاج، طائرانِ ہند کے پروں سے سجا ہوا، ان کے سر پر تھا۔ چار حبشی غلام نیچے سے تاج کو روکے ہوئے تھے۔ مجھے اس خیال سے وحشت ہونے لگی کہ اگر کہیں ایک بھی غلام کا ہاتھ ڈھیلا ہو جائے تو یہ زبردست تاج گردنِ شاہانہ کو شکستہ کر دے گا۔ ظاہر ہے میری پریشانی فضول تھی، اس لیے کہ یہ غلام قلچاق کے بردوں میں سے چھانٹ کر لائے گئے تھے، پھر بھی، چونکہ میرا عقیدہ ہے کہ ہمیشہ احتیاط کے تقاضوں کو نظر میں رکھنا چاہیے اس لیے میں نے بادشاہ سلامت پر اپنا اندیشہ ظاہر کر دیا اور وہ میری دانائی اور دور اندیشی سے اس قدر خوش ہوئے کہ انھوں نے مجھ کو غلاموں کی جماعت میں شمولیت کا حکم دے دیا۔

زیادہ تر خوابوں میں بادشاہ سلامت مجھ کو یوں نظر آتے تھے کہ ان کی غضب ناک نگاہوں کے آگے کرۂ ارض کا نقشہ پھیلا ہوا ہے۔ یہ نقشہ مہندسوں اور ماہرینِ تعمیرات نے بارگاہِ سلطانی کے دانشمند وزیروں کی کمک سے تیار کیا ہے۔ بادشاہ سلامت عالمِ جلال میں ہیں — کبھی کبھی قصدِ شاہی یہی ہوتا ہے کہ غصہ فرمایا جائے — اور غیظِ ہمایونی سے وزیر اور ندیم اور حاجب اور اس حقیر سے لے کر دیواروں کے اینٹ پتھر تک بید کی طرح کانپ رہے ہیں۔ یہ بات دیگر ہے کہ قسمت ہمارا بڑا ساتھ دیتی تھی — اکثر تو قسمت ہی ساتھ دیتی تھی۔ مجھے یاد ہے، میرے ایک خواب میں ارادۂ ملوکانہ یوں ہوا کہ کھانسا جائے، لیکن ناگہاں کھانسی کے بجائے چھینک سرزد ہوگئی۔ بس، حاضر باشوں کو اور خود بندے کو اپنی آنکھوں کے آگے موت کی پرچھائیں نظر آنے لگی۔ بادشاہِ جہاں ایسے غضب ناک ہوئے کہ ان کے تختِ مرصع کے یاقوت وزمرد تک کا رنگ اڑ گیا۔ بادشاہ سلامت کا ارادہ ہوا کہ بائیں طرف والے وزیر کے کان اور داہنی جانب والے وزیر کی ناک اڑا دیں اور جملہ حاضرین کی زبانیں حلق سے باہر کھینچ لیں۔ اب دیکھیے قسمت کس طرح ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ مفخر الشعرا جو حضوری میں موجود تھے، انھوں نے فی البدیہہ یہ رباعی موزوں کر کے پڑھ دی:

گر شاہِ جہاں ارادہ کرد بر سرفہ
اما زمبارک دہنش رفت عدسہ
شاہا، چہ کند باد کہ سرگردان است
خوش یُمن بود کہ باد نہ ماند در عرصہ

اور حسن اتفاق سے یہ رباعی بادشاہ سلامت کے اس قدر پسندِ خاطر ہوئی کہ فی الفور انھوں نے تبسم فرمایا اور حکم صادر کیا کہ تین دن اور تین رات تک متواتر اسی کو گایا جائے، اور خود اپنے دستِ مبارک سے تین مرتبہ مفخر الشعرا کا منھ موتیوں سے بھر دیا۔

موضوع سے نہ ہٹوں، تو ذکر غضبِ ہمایونی کا اور کرۂ ارض کے نقشوں کا تھا۔ بادشاہ سلامت اپنی چمکیلی آنکھیں بند کیے ہوتے تھے اور ان کی نازنین انگلی، وہ والی جس میں فیروزے کی انگوٹھی تھی، فضا میں چکر کاٹ رہی ہوتی تھی، ایک چکر، دو چکر، اور پھر نیزے کی طرح نیچے

جھلکتی۔ نقشے کا جو حصہ زیرِ انگشتِ مبارک آجاتا اس کو ہمارے وطنِ عزیز کی بے مثال زرخیز مٹی میں مل جانا ہوتا تھا۔ اس وقت بادشاہ سلامت خاصے پر تشریف فرما ہوتے تھے۔ ندیم خدمت میں مصروف رہتے اور مطرب گانے بجانے میں، اور دورِ شراب چل رہا ہوتا تھا۔ تین شبانہ روز تک ہم بادہ نوشی کرتے رہتے۔ ڈھائی من شراب کے صَرف کے بعد مزاجِ مبارک بحال اور طبیعت خرسند ہوتی، تب وہ گونجتی ہوئی آواز میں کوچ کا حکم دیتے۔ فراش سلطانی جامے حاضر کرتے۔ بادشاہ سلامت لباسِ جنگی زیب تن فرماتے: کلاہ اور خود اور زرہ اور خفتان اور ایک سرخ پارچہ قہر وجلال کے اظہار میں کندھوں پر پڑا ہوا۔ حملے کی صورتیں اور دوسرے امورِ جنگ طے کرنے کے لیے ہم ایک بڑے قلعے کو روانہ ہو جاتے جس کے چاروں برج آسمانی رنگ کے روغنی کھپروں سے آراستہ ہوتے تھے۔ تین سو فیلانِ ہندی پر کسے ہوئے تین سو ہودجوں میں ہزارہا پری چہرہ مہ لقائیں بھی حاضر رہتیں۔ ہمارے شہنشاہ جنگی معاملات کے ساتھ ساتھ ملکی معاملات کو بھی پوری اہمیت دیتے تھے۔

میں بھی اپنی دیبائے لعل اور قبائے زر اتار کر لباسِ جنگ پہنتا اور خاصہ خانے سے، جہاں ہر طرف مشک وعنبر کی لپٹیں ہوتیں، باہر آتا۔ جدھر دیکھو آگ کے جھاڑ حملے کے دن کی نشاندہی کے طور پر جل رہے ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آگ نے میری غضب ناک آنکھوں کی سرخی مستعار لی ہے، ایسی سرخی کہ دیکھنے سے بغیر ہی دشمنوں کے دم نکل جاتے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے ڈاکٹر صاحب کہ اس وقت میں کیسے جوش اور جلال میں ہوتا تھا۔ تب میں اپنے برق سیر نقرہ گھوڑے پر سوار ہوتا اور بجلی کی سرعت سے یوں دھاوا کرتا کہ غبار کے بادل زمین وزمان پر چھا جاتے۔

معاف فرمایئے گا ڈاکٹر صاحب، افسوس، میں ایسا جذباتی ہوگیا کہ اپنے آپے میں نہیں رہا۔ مگر یقین کیجیے میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اسی طرح بے قابو ہو جاتا۔

خیر، تو اپنی داستان پوری کروں۔ آدھا سال میں نے یہ میٹھے میٹھے خواب دیکھتے ہوئے ہنسی خوشی گذار دیا۔ میں بہت مگن تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ میں کبھی شکست نہیں کھاتا تھا اور اسی کے ساتھ کبھی خون بھی نہیں دیکھتا تھا۔ جب بھی تلوار چلاتا یا گرزِ آتشیں گھماتا، کسی نہ کسی سر کو گیند کی

طرح ہوا میں اچھال دیتا، لیکن کبھی پلٹ کر دیکھتا نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ اپنے سورما پرکھوں کے برخلاف مجھ کو خون سے ڈر لگتا ہے۔

قصہ مختصر کرتا ہوں۔ میرے سنہرے خواب جو ہمیشہ فتح وفیروزی پر ختم ہوتے تھے، اب شکست کا بھی مزہ چکھنے لگے۔ آپ جانتے ہیں یہ میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔ کوشش کرتا کہ شکست نہ کھاؤں لیکن خوابوں کی چیرہ دستی کے آگے میری ایک نہ چلتی۔ میں صاف شکست کھا جاتا، بالکل صاف!

یقین جانیے ڈاکٹر صاحب، یہ بڑی وحشت ناک چیز ہے۔ میرا ملک، اس شان وشکوہ کو پہنچنے کے بعد، ایک پارۂ نان ہوکر رہ گیا تھا کہ ہر بے مادر و پدر اس میں سے ایک ایک لقمہ نوچ کر کھائے جا رہا تھا۔ اپنے سپاہیوں کی کمک، بادشاہ سلامت کی بلند ہمتی اور سرداروں، وزیروں کی شجاعت کے بل بوتے پر جو علاقے ہم نے اپنی مملکت میں شامل کیے تھے وہ سب ہم سے واپس لیے جا رہے تھے یا انھیں زبردستی ہڑپ کیا جا رہا تھا۔ لعنت ہو شیاطین پر۔

اب مجھے اپنے خوابوں میں کوئی لذت نہ ملتی، بلکہ یہ میرے لیے ایک عذاب بن گئے۔ یہ کابوس میری زندگی کے وحشت ناک ترین واقعات ہیں۔ میں رات سے گھبرانے لگا، صرف اس لیے کہ میرے سونے کا وقت آ پہنچتا اور میں مجبور ہوتا کہ اپنے بستر، بلکہ اپنی عارضی قبر، میں جا لیٹوں تاکہ کئی گھنٹے تک عذاب جھیلتا رہوں۔ آخر میرا سونا، کھانا پینا چھٹ گیا اور میں دن پر دن زیادہ بیمار ہوتا گیا۔ وائے ہو میرے حال پر، اپنے اجداد بزرگ کو کیا منھ دکھاؤں گا۔ پھر بتایئے آنسو نہ بہاؤں؟ دیواروں سے سر نہ ٹکراؤں؟ کنویں میں نہ پھاند پڑوں؟ اس اذیت کو آخر کہاں لے جاؤں؟

لیکن یہ جو میں نے بیان کیا، فقط یہی ایک اذیت نہیں ہے۔ میں کتنے ہی تاریخی کرداروں سے لڑا ہوں اور کتنے ہی تاریخی کردار مجھ سے لڑنے آئے ہیں۔ یقین کیجیے ڈاکٹر صاحب، اگر اس منگول خان، یا اس پھٹی ہوئی آنکھوں والے ترک، یا اس بے لحاظ افغان کی صورت اور مہیب سراپا کسی اور کو خواب میں دکھائی دے جاتا تو ہول کھا کر اس کا دم ہی نکل جاتا، لیکن میں اپنے آبا واجداد کی جنگ آزمائیوں کے طفیل ان منظروں کی تاب لا سکا اور دن رات میں سات سات گھنٹے تک ان

وحشی چہروں کو دیکھا کیا۔ ان کی جفا کاریاں، ان کی زور زبردستیاں، ان کی آتش زنی، ان کی کتاب سوزی دیکھ دیکھ کر میرا دل کڑھتا تھا لیکن میں سب کی تاب لاتا تھا تاوقتے کہ صبح ہو جائے اور میں منھ لٹکائے، گردن جھکائے اپنی دفتری میز کے پیچھے پناہ لوں۔

تب، اچانک ایک نئی بیماری نے مجھ کو آدبوچا۔

ایک دن میں حسب معمول اپنے دفتر — ادارۂ احیاے ماضی — میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کوئی میری میز کے سامنے موجود ہے۔ سر جو اٹھایا تو دیکھتا ہوں چنگیز خان منگول کھڑا ہے۔ وہی جنگی لباس، ننگی تلوار، چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی آنکھیں، دولخت مونچھیں۔ قسمیہ کہتا ہوں، میں اتنا سا بھی نہیں ڈرا، بلکہ مجھے پوری جان سے طیش آ گیا۔ اجداد کا خون میری رگوں میں سنسنانے لگا اور میرے اندر ایک نئی قوت دوڑ گئی۔ بڑے جوش وخروش کے ساتھ میں نے میز پر سے اسکیل اٹھا کر وار کیا کہ اس کا سر تن سے جدا کر دوں۔ اس نے وار خالی دیا، تب میں بجلی کی طرح تڑپ کر میز کے پیچھے سے نکلا اور اس کے سینے کو قیمہ قیمہ کر دینے کے ارادے سے اس پر جھپٹا ہی تھا کہ کچھ لوگوں نے میرے ہاتھ پیر جکڑ لیے اور چیخ چیخ کر پوچھنے لگے:

"آقاے ماضی، آقاے ماضی، ہوش میں آئیے، آخر بات کیا ہے؟"

اور میں چلا رہا تھا:

"چھوڑ دو مجھے۔ میں اس نطفۂ حرام کا سر قلم کر دوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب، یقین فرمایئے مجھے شرم آ رہی ہے، لیکن بتانا پڑتا ہے کہ میں دراصل آقاے اطاعتی پر ٹوٹ پڑا تھا جو چھٹی اور ساتویں صدی کے تاریخی احیا کے نگراں تھے۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی، اس دن کے بعد بھی میں نے اپنے کتنے ہی رفیقوں، حتیٰ کہ ادارے کے سربراہ کو بھی، سکندر اور تیمور، چنگیز اور خلیفۂ بغداد اور محمود افغان تصور کر کے پیٹ ڈالا، اور بالآخر تھوڑے ہی دن کے اندر، خانوادۂ ماضی کی آبرو محفوظ رکھنے کے لیے، مجھے استعفیٰ دینا پڑ گیا۔

خانہ نشین ہونے کے بعد ایک مدت تک میں نے کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا، یہاں تک کہ نادر شاہ کی تصویر بھی طاقچے سے ہٹا دی، سیاست کو طلاق دے کر دوسرے فنون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ریڈیو تک سننا چھوڑ دیا۔ راتوں کو دیر تک جاگتا اور مشقت کرتا، مثلاً تارے گنتا، زیادہ

سے زیادہ سوئیوں میں تاگا پرونے کی کوشش کرتا اور اس طرح خود کو اتنا تھکالینا چاہتا تھا کہ وہ وحشت ناک خواب میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب، کوشش بیکار گئی۔ ابھی ان عجوبہ تاریخی خوابوں کی اذیت رفع نہیں ہوئی تھی کہ نئے نئے کابوس، نئے نئے موضوعوں کے ساتھ آ پہنچے۔

کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ آدمی ایسے وحشت ناک خواب دیکھتا ہے اور ایک لمحے کو بھی نہیں سمجھ پاتا کہ وہ اپنے ہی گھر میں اور اپنے ہی بستر پر ہے۔ خواب کی دنیا اسے حقیقت کی دنیا معلوم ہوتی ہے اور یہیں سے اس کی پریشانی شروع ہوتی ہے کہ سڑک پر چہل قدمی کو نکلتا ہے تو دیکھتا ہے کہ موٹروں میں عام پہیوں کی جگہ لکڑی کے پہیے لگے ہوئے ہیں— واقعی عجیب سے لگ رہے تھے— بجلی کے کھمبوں پر چربی کے چراغ جل رہے ہیں اور لوگ دگلے اور فرغل پہنے، بے ہنگم ٹوپیاں سروں پر منڈھے، اسے اس طرح گھور رہے ہیں گویا وہ کوئی چور اچکا یا ناقص الہیئت مخلوق ہو۔

سڑکیں بھی کچھ کی کچھ ہوگئی ہیں۔ محرابیں، قوسی چھتیں، چکنی اینٹوں کے ستون، گشتی سپاہیوں کے بجائے دوگوشیہ چوگوشیہ کلاہوں والے برقنداز ہاتھوں میں روپہلے عصا تھامے نظر آ رہے ہیں۔ ان برقندازوں کی گھنی مونچھیں ایسی خوفناک ہوتی ہیں کہ جب وہ اپنے سروں، بھنوؤں اور ڈاڑھی مونچھوں کے جھاڑ جھنکاڑ میں سے مجھ کو گھورتے ہیں تو میرا دل بیٹھنے لگتا ہے اور سانس الٹی چلنے لگتی ہے۔ آخر خدا کا کرم ہوتا ہے اور میں چیخیں مارتا ہوا جاگ پڑتا ہوں اور نذر نیاز شروع کرتا ہوں کہ ایسی شکلیں دیکھ کر بھی زندہ ہوں۔

میں ایک ہیجانی خواب کا ضرور ذکر کروں گا جو پلٹ پلٹ کر آتا ہے اور میرے تن بدن میں تھرتھری ڈال دیتا ہے۔ دیکھتا ہوں کہ ایک وسیع میدان کے گوشے میں بیٹھا ہوں۔ میدان میں ہریالی سے گھرے ہوئے حوض ہیں۔ چہار جانب دورستہ بازاروں کے سلسلے ہیں، اور بازار بھی کیسے ڈاکٹر صاحب کہ آپ نے کبھی خواب میں نہ دیکھے ہوں گے— محرابی چھتے، نقش و نگار سے لپے ہوئے، رستم سہراب کی جنگ، اسفند یار روئیں تن اور رستم کی لڑائی کے مرقعے، فرہاد کوہکن اور ضحاک ماردوش کی شبیہیں، بازاروں کے اندر فروخت کے مال سے چھلکتے ہوئے حجرے، مال بھی وہ کہ آج ڈھونڈھے نظر نہ آئے: مروارید، یاقوت، ادویۂ ہندی، ابریشم و زربفت

کے پارچے، ململ، تنزیب کے تھان: اس طرف بزازوں کی کوٹھیاں، اس طرف جفت سازوں کے دکانچے، سامنے عطر فروشوں کا بازار، غرض ایک گہما گہمی ہے جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ البتہ یہاں تک کوئی ڈراؤنی بات نہیں ہے، لیکن بس یہیں سے مجھ پر وحشت کا غلبہ ہوتا ہے۔ بازار کے اُدھر ہرے بھرے ٹیلے اور ایک خوبصورت اونچی عمارت نظر آتی ہے۔ یہ حاکم شہر کا محل ہے جس کی شاہ نشینوں کو بلوری ستون سہارے ہوئے ہیں۔ چھتوں اور دیواروں پر رنگ برنگ شیشہ بندی اور طلاکاری، کاشی کے آسمانی ٹائلوں پر طرح طرح کے مرقعے، حاکم اعلیٰ کے شکار کے مناظر۔ جدھر دیکھو وہی دوگوشیہ چوگوشیہ ٹوپیوں والے، آتشیں گرزوں سے مسلح گھوم رہے ہیں۔ توجہ کے قابل بات یہ ہے کہ انھیں میں سے ایک خواب نے رنگ بدل کر کچھ تفریح کا سامان بھی کر دیا۔ محل کے جلوخانے میں مداری اور رقاص، ظاہرا ہندی بنجاروں کی یادگار، اپنا اپنا فن دکھا رہے تھے۔ خیر چھوڑیے، یہ خواب دوبارہ پلٹ کر نہیں آیا۔ مصیبت یہ ہے کہ زیادہ تر خوابوں میں سہ پہر کی چہل قدمی کے بعد، یعنی غروبِ آفتاب کے قریب، اچانک کچھ لوگ میرا گریبان پکڑ لیتے ہیں اور مجھے کھینچتے ہوئے حاکم کے پاس لے جاتے ہیں۔ حاکم مے نوشی میں مصروف ہے کہ میں اس کے سامنے گیند کی طرح لڑھکا دیا جاتا ہوں۔ حاکم کو ایسا تاؤ چڑھتا ہے کہ اس کے گال تمتما کر اس کے جام کی شراب کے مانند سرخ ہو جاتے ہیں، تب وہ گلا پھاڑ کر چیختا ہے:

''اڑا دو گردن اس پدر سوختہ کی جس نے ہمارا مزہ کرکرا کر دیا۔''

خدا آپ کو خواب میں نہ دکھائے، ڈاکٹر صاحب، بھاری بازوؤں اور بڑی سی توند والا جلاد، چہرے پر سرخ ڈھاٹا جس میں سے خون آلود آنکھیں جھانکتی ہوئی، چوڑے پھل کا تیغہ تانے میری سمت بڑھتا ہے۔ منت وزاری بے سود ہے، کوئی نہیں جو مجھ اجل گرفتہ کی فریاد سنے۔ جیسے ہی تیغہ مجھ پر پڑتا ہے، میں ہمیشہ کی طرح ہائے واویلا کرتا جاگ پڑتا ہوں اور ابھی اس دھچکے سے سنبھلنے بھی نہیں پاتا کہ ہمسایوں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں:

''یہ آدمی پگلا گیا ہے، ہر رات ہلڑ مچاتا ہے۔ اسے محلے سے نکال باہر کرو۔ جا کے ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے جی؟ ہسپتال میں بھرتی ہو جاؤ۔ ذرا اپنی چونچ بند رکھا کرو۔'' وغیرہ وغیرہ۔

جی ہاں ڈاکٹر صاحب، ایکڑوں زمین اور کتنی جاگیروں کے مالک معتمد الماضی کا بیٹا، اس

خواجہ پہلوان ماضی باشی کا پوتا جس نے آغا محمد خان قاجار کے سامنے ایک ہاتھ سے ایک گدھے کی گردن توڑ دی تھی، وہ سڑی ہو کر اسپتال میں بھرتی ہوا! تف ہے مجھ ننگ خاندان پر۔

یہاں تک کہ... کل رات میں نے ایک نئے موضوع کا نیا خواب دیکھا تو اس خوف سے کہ کہیں یہ بھی پلٹ پلٹ کر نہ آنے لگے، میں نے ایک نیا عہد کیا۔ ایک بار اپنے خاندان کی آبرو بچانے کے لیے میں نے ملازمت سے استعفیٰ دیا تھا، یہ کوئی کم سبکی کی بات نہیں تھی، پھر بھی میں نے پکا ارادہ کرلیا کہ ایک بار اور سبکی مول لوں اور ان خوابوں کے بارے میں کسی ماہرِ نفسیات سے بات کروں۔ آپ کل رات والے خواب کا ماجرا بھی ضرور سننا چاہتے ہوں گے۔ دیکھیے، بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ماجرا کچھ یوں تھا:

میں اطمینان کے ساتھ ایک پرانے قلعے میں ٹہل رہا تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں مگر شاید کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔ محض اتفاق تھا کہ بہت مگن تھا۔ یکا یک ایک شور برپا ہوگیا۔ کوئی آواز، زمین پر زور زور سے پڑتے ہوئے قدموں کی آواز، تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پاگل جنگلی گھوڑے قلعے کے کوچوں میں سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ اچانک ایک نعرے نے مجھے چونکا دیا:

''آؤ... یہاں ہے... پکڑلو... جانے نہ پائے۔''

اور، ہرچند میرا دم نکلا جارہا تھا مگر مجھ میں کچھ غیر معمولی طاقت آگئی اور میں جان توڑ کے بھاگا۔ میں کسی ان دیکھے فوجی دستے سے بھاگ رہا تھا جو میرے تعاقب میں تھا۔ جتنا جتنا میں بھاگ رہا تھا، زمین پر پڑتے ہوئے بھاری قدموں کی دھمک میرے اور بھی نزدیک ہوتی جارہی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تعاقب کرنے والے دستے کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن بھاگتے میں مڑنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ آخرکار جب آوازیں بالکل ہی سر پر آگئیں اور بھاگنے میں کوئی فائدہ نظر نہ آیا تو میں نے سوچا کم ازکم پشت پر تو زخم نہ کھاؤں، اس لیے موت سے کھیلنے پر تیار ہوکر میں گھوم پڑا۔ جناب ڈاکٹر صاحب، اللہ آپ کو روزِ بد نہ دکھائے، میرا پیچھا کرنے والی جماعت اصل میں بہت سی کتابیں تھیں جن کے ہاتھ پیر نکل آئے تھے۔ وائے برحالِ من! میں چلّا اٹھا، میں نے نعرہ مارا، پھر میں چیخا، اور پھر چیخا اور افسوس کہ یہ سب ہنگامہ میں نے کسی قلعے میں نہیں، اپنے بستر میں مچایا تھا، اور ایک بار پھر اپنے ہمسایوں کو جگا دیا تھا۔

اور اب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ کو اپنے پیاروں کی قسم، مجھے بچا لیجیے۔ یہ کابوس مجھ کو پاگل کیے دے رہے ہیں۔ آپ پچاس گولیاں روز کھلایئے، ایک ایک دن میں سو سو انجکشن لگایئے، مجھے سب منظور ہے، بس یہ خواب میرا پیچھا چھوڑ دیں۔

❄

آقاے ماضی نے خاموش ہوکر کچھ دیر تک متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر رونا شروع کر دیا۔ اس درد سے روئے اور ایسے ایسے بین کیے کہ ڈاکٹر آشنا پر سخت اثر ہوا اور بلاارادہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ یہ ایک پر شکوہ لمحہ تھا۔ ڈاکٹری کی تاریخ میں پہلی بار ایک بیمار دوست معالج اپنے مریض کی بیماری پر رو رہا تھا اور ڈاکٹری کی دنیا اس واقعے پر پھولے نہیں سماتی تھی۔ اس کیس نے ڈاکٹر آشنا کو ایسا ہلا کے رکھ دیا کہ ایک طویل مدت میں پہلی مرتبہ وہ کتاب سے رجوع کرنے پر مائل ہوا۔ ڈاکٹری کی بھاری بھرکم کتابوں کا دیر تک مطالعہ کرتے رہنے کے بعد وہ ہنستا ہوا آقاے ماضی کے نزدیک آیا اور ملائمت سے بولا:

''میرے دوست، آیئے کچھ دیر ہم آپ باتیں کرتے ہیں۔''

❄

رات۔ آقاے ماضی اپنے کمرے میں چکر کاٹ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کسی سخت ادھیڑ بن میں مبتلا ہیں۔ گاہ گاہ پلٹ کر اپنے بستر کو دیکھتے، پھر فوراً ہی دوسری طرف بڑھ جاتے۔ ان کے چہرے پر بڑھاپے کی سی جھریاں پڑ گئی تھیں، آنکھیں پتھرائی ہوئی اور بدن ٹوٹتا ہوا۔ وہ کھڑکی پر گئے اور گھور گھور کر اندھیرے میں کچھ دیکھنے لگے۔

❄

کچھ دن بعد اخبار پڑھتے ہوئے ڈاکٹر آشنا نے حادثات کے کالم میں یہ خبر دیکھی:

مشہور محقق آقاے ماضی نے خودکشی کرلی۔ خودکشی کرنے کے وقت وہ اپنی آخری تصنیف آقاے ماضی کے عجیب و غریب خواب کی تحریر میں مصروف تھے جو ان جملوں پر ختم ہوئی ہے:

''ڈاکٹر نے کہا: میرے دوست، دو ہی راستے رہ گئے ہیں، یا تو آئندہ کا خیرمقدم کیجیے، یا حال کو الوداع کہیے۔

''اوراس نے دوسرا راستہ چن لیا۔''

❄❄

(فارسی عنوان: ''خوابہای عجیب آقای ماضی'')

منو چہر خسرو شاہی

مرگ

بہار آتے ہی وہ نمودار ہو گئے تھے۔ شروع شروع میں کچھ بہت زیادہ نہیں تھے، بس کہیں کہیں دکھائی دے جاتے تھے کہ خود کو ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر گھسیٹ کر لیے جا رہے ہیں، اور اس میں کوئی کوئی ہلکان ہو کر زمین پر ٹپک پڑتا۔ تم اس کے قریب جاتے تو دیکھتے کہ وہ کس طرح پڑے پڑے بل کھا رہا ہے اور اتنی اتنی سی ٹانگیں ہوا میں چلا رہا ہے۔ میں ان دنوں درخت پر بہت چڑھا کرتا تھا اور ان میں سے جو زمین پر آ رہتے تھے ان کو روز دیکھتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ میں دیر دیر تک کسی ایک کے قریب کھڑا اس کے ہاتھ پاؤں مارنے کا تماشا دیکھتا رہتا۔ اس کی جدوجہد بیکار جاتی اور اسے سنبھلنا نصیب نہ ہوتا۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ جو بھی نیچے ٹپکتا، پہلے تو بڑا زور لگاتا، بل کھاتا، ہاتھ پاؤں پھینکتا، لیکن رفتہ رفتہ سست پڑنے لگتا اور آخر اپنی جگہ پر لمبا لمبا لیٹ جاتا۔ اور ٹھیک اس وقت چیونٹیوں کی پہلی کھیپ آ پہنچتی، اور میں دیکھتا کہ کس طرح وہ اس کے گرد چکر کاٹ رہی ہیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے سینگوں سے چھو چھو کر اس کی جسامت کا اندازہ کر رہی ہیں۔ ان کے پہلے لمس سے اس نڈھال بدن میں دوبارہ جان سی پڑ جاتی۔ وہ سنبھالا لیتا اور پھر سے بل کھانے لگتا۔ کئی بار اس کی ٹانگوں کو جھٹکے لگتے، لیکن اب مہلت نہیں مل سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چیونٹیاں کسی ان دیکھے مرکز سے ابلتی چلی آ رہی ہیں۔ دیکھتے دیکھتے وہ اس کے پورے بدن کو ڈھانپ لیتیں اور سب اسے اپنی اپنی طرف کھینچتیں، اس کا ایک ایک ریزہ نوچ کر لے جاتیں۔ پھر اس بے ہیئت وجود میں نمی کی جو دو ایک بوندیں رہ جاتیں انھیں دھوپ چوس لیتی اور تھوڑی دیر بعد تم دیکھتے کہ کس طرح وہ سوکھا، سیاہ اور نچا کھچا، درخت کے نیچے پڑا رہ گیا ہے۔

چیونٹیاں بڑی پھرتی سے اپنا کام کرتی تھیں۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے چھٹی کر دیتیں اور ان

کچلے اور سوکھے ہوے جسموں میں سے چند ٹیڑھی میڑھی اور ٹوٹی پھوٹی ٹانگوں کے سوا کچھ نہ رہ جاتا۔

ہاں، یہی ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو میں جب بھی دیکھتا کہ ان میں سے کوئی نیچے ٹپکا ہے تو اس کے قریب پہنچ جاتا اور اس کھیل کو آخر تک دیکھتا تھا، لیکن اس کے بعد ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ اگر دنیا بھر کی چیونٹیاں اکٹھا ہو جاتیں تو بھی ان کو ٹھکانے نہیں لگا سکتی تھیں۔

کبھی کبھی، جب رات کو میری نیند اڑی ہوئی ہوتی، میں بستر میں بیٹھا کان لگائے رہتا۔

ٹپ... لو، ایک اور...

❄

اس کے بعد مجھے رات رات بھر جاگتے گذرنے لگی، اس لیے کہ یہ آواز مستقل میرے کانوں میں آتی رہتی تھی۔

ایک رات میں کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے ماں کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ میرے سامنے بار بار روئی تھی۔ میں اس کا رونا پہچانتا تھا: چھوٹی چھوٹی ہچکیاں، اور بین جو سمجھ میں نہیں آتے تھے، جیسے اپنے آپ کو مرثیہ سنا رہی ہو۔ اس رات میں نے اس کا رونا سنا تو ایسا محسوس ہوا کہ میرے اندر سے کوئی شے چیخ کر الگ ہو گئی۔ میں کپکپا کر رہ گیا اور مجھ کو ساری دنیا گریہ کرتی معلوم ہوئی۔ ماں کی ہچکیوں کی آواز فضا میں پیچ کھاتی اور پھر ان کی ٹپ ٹپ کی آواز میں مل کر ایک ہو جاتی۔ وہ لگاتار ٹپک رہے تھے اور ماں رو رہی تھی، روئے جا رہی تھی۔

میں چیخیں مارتا ہوا کمرے سے باہر لپکا، اور ٹھیک اس وقت کوئی چیز میرے سر پر گری — ٹپ — پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا۔

❄

ماں کہنے لگی:

"یہ درخت اب کی گرمیوں تک نہیں رہ پائے گا۔ سارے گھر میں چیونٹیاں بھر گئی ہیں،

کیڑوں کو لے جانے کے لیے جھنڈ بنا بنا کر آتی ہیں، مگر یہ تو اتنے ہو گئے ہیں کہ چیونٹیوں کے بس کے نہیں رہے۔ دن میں کتنی کتنی بار صحن میں جھاڑو دیتی ہوں، کچھ فائدہ نہیں۔ اب تو کوڑا گاڑی ہمارے یہاں سے بس کیڑے اور چیونٹیاں ڈھونے بھر کی رہ گئی ہے۔''

ہمارے گھر کا اکیلا درخت کیڑوں میں بدلا جا رہا تھا اور چیونٹیاں انھیں اپنے بلوں میں لیے جا رہی تھیں۔ اب کے انھیں جاڑوں کی خوراک کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔

وہ انڈے دیتیں اور بہار آتی تو جوان چیونٹیاں بلوں سے رینگتی ہوئی باہر آتیں۔ بہار آتی تو ہمارا درخت بھی چیونٹیوں کی صورت جوان ہو کر ابھرتا تھا۔

ہمارے گھر کا اکیلا درخت جو آتے جاتے موسموں کا آئینہ تھا، جاڑوں میں اس کی شاخیں ننگی ہو جاتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ سردی سے کانپ رہا ہے اور بے مروّت آسمان سے ذرا سی دھوپ کی بھیک مانگ رہا ہے۔ بہار آتی تو ہری ہری صاف ستھری پتیوں سے خود کو سجا لیتا اور گئی بہاروں کی یاد تازہ کرتا۔ اور گرمیاں—— گرمیوں میں تو ہم بھی اس کے محتاج رہتے۔ وہ اپنی چھاؤں بے دریغ ہم پر لٹاتا اور خود جھلستی دوپہروں کی دھوپ کا جم کر مقابلہ کرتا۔ شام ہوتے جب سورج ڈوبنے لگتا اور درخت کا سایہ دور تک پھیل جاتا تو صحن میں جھاڑو دی جاتی، چھڑکاؤ کیا جاتا اور درخت کے نیچے قالین بچھا دیا جاتا۔ سماور کی سریلی سنسناہٹ اور پیالیوں طشتریوں کی کھنک سنائی دیتی۔ ہڑبڑائی ہوئی ماں جلدی جلدی سب سامان تیار کر کے لگا دیتی، اور میں الکسایا ہوا کمرے سے باہر نکلتا اور سماور کی چوکی کے پاس آ بیٹھتا۔

گذشتہ گرمیوں تک یہی معمول تھا۔ گذشتہ گرمیوں تک میرا باپ زندہ تھا۔ اس کا تخت اسی درخت کے نیچے بچھایا جاتا تھا۔ ہم دو لوگ اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے لاتے۔ یہیں پر وہ ہلکا چادرا اوڑھے لیٹا رہتا تھا۔ ماں اس کا سرہانہ ٹھیک کرتی اور وہ تکیے سے ٹیک لگائے دھیرے دھیرے ہانپتا اور ہمیں دیکھتا رہتا تھا۔ وہ مفلوج تھا۔ موت نے اس پر وار کیا تھا جو کاری نہیں پڑا، وہ فقط اپاہج اور گونگا ہو گیا تھا۔

معالجوں کا کہنا تھا امید رکھنا چاہیے۔ اگر وہ دوسرے حملے کو بھی جھیل لے جائے... دوسرا وار... میں جانتا تھا کہ وہ دوسرے وار کو نہیں روک پائے گا۔

کبھی کبھی ایک بڑے میاں، جو ہمارے یہاں آنے جانے والے واحد پڑوسی تھے، میرے باپ کی احوال پرسی کے لیے آ نکلتے اور چائے کے برتنوں کے پاس کچھ دیر بیٹھتے۔ ان کی ٹھوڑی ہلتی رہتی اور نقلی دانتوں کا ڈھیلا چوکا منھ میں اِدھر اُدھر ہوا کرتا۔ وہ میرے باپ کے سوکھے ہوئے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتے:

''کہو بھئی، کیا حال ہے؟ ٹھیک ہو؟''

پھر تسبیح گھما گھما کر وظیفہ پڑھنے لگتے۔ ماں اپنا چہرہ ڈھانک کر ایک طرف سمٹ جاتی۔ بڑے میاں اس سے بات نہیں کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چلے جاتے اور گھر پھر سے خالی ہو جاتا۔

گرمیاں نکل گئیں۔ شروع جاڑوں میں موت نے دوسری اور کاری ضرب لگا ہی دی۔ اب اگر درخت گرمیوں تک رہ بھی جاتا، اگر سارے کیڑے اور چیونٹیاں غائب بھی ہو جاتیں اور یہ کابوس جاتا بھی رہتا، اور پھر سے شام کو صحن میں جھاڑو اور چھڑکاؤ کی ہماہمی ہونے لگتی اور سماور سے سریلی سنسناہٹ بلند ہوا کرتی، تو بھی میرا باپ نہ ہوتا کہ تخت پر پڑا دھیرے دھیرے ہانپتا رہے اور ہمیں دیکھتا رہے۔

❋

درخت گرمیوں تک نہیں رہ پائے گا، جیسے میرا باپ نہیں رہ پایا۔ درخت آہستہ آہستہ مر چلا تھا۔ اندر ہی اندر بوسیدہ ہو ہو کر کیڑوں کی شکل میں باہر ٹپک رہا تھا اور سیدھا چیونٹیوں کے پُرپیچ، تاریک، رازوں بھرے تہ خانوں میں پہنچ رہا تھا اور وہاں اس کا انبار لگ رہا تھا۔

درخت مر رہا تھا اور ہمارا خالی گھر اور بھی خالی ہوا جا رہا تھا۔

آخر چارہ جوئی شروع ہوئی۔ پہلے تو میں نے پڑوس والے بڑے میاں کو بلوا بھیجا جو میرے باپ کے فاتحے کے بعد سے ہمارے یہاں نہیں آئے تھے، البتہ کبھی کبھار گلی میں آتے جاتے ملتے تو صاحب سلامت اور مختصر احوال پرسی کر لیا کرتے تھے۔ وہ غروب کے وقت آئے۔ کچھ شرمندہ، کچھ افسردہ سے تھے۔ ہاتھ میں وہی سی تسبیح دھیرے دھیرے گھما رہے تھے۔ ماں سر

سے چادر اوڑھ کر دروازے کے پاس آ بیٹھی۔ بڑے میاں نے آہستہ سے حال پوچھا، وہی ہمیشہ والی احوال پرسی جو میرے باپ سے ہوتی تھی:

''کہو بھئی، کیا حال ہے؟ ٹھیک ہو؟''

میں نے انھیں معاملہ بتایا۔ اس وقت میں تھوڑا جھنجھلایا ہوا تھا۔ بڑے میاں کسی سوچ میں ڈوب گئے، پھر بولے:

''چلو، ذرا دیکھیں تو۔''

میں نے چراغ جلایا اور ہم اندر صحن میں آ گئے۔

درخت بھر پر کیڑوں کے ردّے جمے ہوئے تھے۔ پھر ''ٹپ ٹپ'' کی آوازیں سنائی دیں۔ ماں بولی:

''ابھی شام ہی کو جھاڑو دے کر باہر پھینک چکی ہوں۔ اسی طرح ٹپکے جا رہے ہیں۔ اے اللہ، تو ہی کچھ کر۔''

بڑے میاں کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ منھ ہی منھ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے اور کیڑوں کو گھور رہے تھے۔ پھر انھوں نے گردن اٹھائی اور درخت کے تنے اور ٹہنیوں کو دیکھا کہ کوڑھیوں کے بدن کی طرح گل رہے ہیں۔

پھر ہم کمرے کے اندر آ گئے۔ چراغ کی روشنی میں یہ دیکھ کر میں سن رہ گیا کہ ایک کیڑا بڑے میاں کے شانے پر سے ٹپکا اور فرش پر بل کھانے لگا۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر اسے مارا اور کمرے کے بیچ میں ڈال دیا۔ ماں لپکی، اسے ایک کاغذ سے پکڑ کر اٹھایا اور باہر پھینک آئی۔

بڑے میاں کہنے لگے:

''میں سوچ رہا تھا مٹی بدلوا دی جائے، لیکن اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ مٹی میں بھی کیڑے پڑ گئے ہیں۔ اب کوئی صورت نہیں۔ لکڑہاروں کو بلوانا ہوگا۔''

دوسرے دن آدمی آ گئے۔ بڑے میاں نے انھیں بھیجا تھا کہ درخت کو جڑ سے کھود کر لے جائیں۔

❊

ماں کمرے کے اندر تھی۔ چادر والیاں اس کو گھیرے ہوے تسلی دے رہی تھیں۔ ہر طرف رونے کی آواز تھی۔ مرد پہلو والے کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ سب اکتائے ہوے اور اداس اداس تھے۔ ابھی صبح ہوئی تھی لیکن معلوم ہوتا تھا اندھیرا ہو رہا ہے۔ سیاہ، متحرک پرچھائیوں سے کمرے بھرے ہوے تھے۔ میرا باپ عقبی کمرے میں تخت پر سیدھا سیدھا لیٹا تھا اور مرا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ڈھک دیا گیا تھا۔ رات سے صبح تک قرآن خوان اس کے سرھانے تلاوت کرتا رہا تھا۔ میں اور میری کھلائی ایک کونے میں سکڑے بیٹھے تھے۔ قرآن خواں نے صبح تک دم بھر کو بھی تلاوت نہیں روکی تھی۔ آدھی رات گئے مجھے نیند آ گئی تھی اور میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میرا باپ دونوں ہاتھ پھیلائے صحن کے بیچوں بیچ کھڑا ہے اور اس کا سارا بدن کیڑوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جب بھی ان میں کوئی کیڑا نیچے ٹپکتا ہے، میرا باپ تھوڑا سا سکڑ جاتا ہے۔ لیکن وہ ہنس رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہنس رہا ہے اور ریزہ ریزہ ہوا جا رہا ہے۔ میں چیخیں مارتا ہوا اس کی طرف دوڑا، اور میری آنکھ کھل گئی۔ قرآن خواں کی آواز، رات کی سیاہی کو بڑھاتی ہوئی، اندھیرے میں تیرتی چلی جا رہی تھی۔ میرا باپ تخت پر سیدھا سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ پوشش کے نیچے اس کا بدن چھوٹا سا معلوم ہو رہا تھا۔

روشنی پھیلی، قرآن خواں کی آواز تھم گئی، سیاہ لباس والے آنا شروع ہوے اور کمرے ان سے بھر گئے۔ پھر اچانک ساری آوازیں بند ہو گئیں، اور میں نے سنا کہ میرے باپ کو لے جانے کے لیے لاش گاڑی آ گئی ہے۔

❁

چھکڑا دروازے پر کھڑا تھا۔ درخت جڑ سے اکھڑ چکا تھا اور بیچ صحن میں سیدھا سیدھا لیٹا تھا۔ کیڑوں سے صحن کے فرش کی اینٹیں چھپ گئی تھیں۔ چیونٹیاں بولائی ہوئی سارے میں دوڑتی پھر رہی تھیں، بدحواس ہو رہی تھیں، اور آدمی گڑھے کے کنارے کھڑے تھے اور ماتھوں سے پسینہ پونچھ رہے تھے۔ گڑھے کے ایک طرف مٹی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

❁

دو آدمی گڑھے کے اندر کھڑے تھے۔ میت لائی گئی تو انھوں نے اسے ہاتھوں پر سنبھال کر نیچے رکھ دیا۔ سب نے درود پڑھا۔ عورتوں کے بین اور بلند ہوگئے اور مردوں کے شانے زیادہ زور زور سے ہلنے لگے۔ ایک ہٹی کٹی عورت ماں کو چھاپ بیٹھی اور اسے تسلی دینے لگی۔ ماں اس کی توند کے نیچے دبی ہوئی کسی چوزے کی طرح کانپ رہی تھی۔ اب سب میرے باپ کو مٹی دینے لگے۔ وہ گٹھری کی طرح سمٹ کر چھوٹا سا رہ گیا تھا۔ مٹی کے نیچے کہیں کہیں اس گٹھری کی سفیدی نظر آرہی تھی، لیکن یہ سفید دھبے دھیرے دھیرے غائب ہو رہے تھے اور ان پر مٹی کی تہہ چڑھتی جارہی تھی۔ رونے پیٹنے کی آوازیں بڑے آہنگ اور باقاعدگی کے ساتھ اونچی ہوتی جاتیں، پھر نیچے آتیں، پھر رفتہ رفتہ اونچی ہوتی جاتیں۔ کوئی کوئی آواز ایسی بھی تھی کہ لمحہ بھر کو کان سے ٹکراتی اور دوسرے لمحے غائب ہوجاتی۔ معلوم ہوتا تھا مدتوں اس کی مشق کی گئی ہے۔

❁

گڑھا پاٹا جاچکا تھا اور اب اینٹیں چنا تھیں۔ صحن میں چیونٹیاں اور کیڑے اور آدمی بھاگتے پھر رہے تھے۔ صحن کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھول دیا گیا تھا اور درخت کو باہر گھسیٹا جارہا تھا۔ اور صحن میں کیڑوں کے گچھے کے گچھے پڑے رہ گئے تھے۔ درخت ہر طرف بیجوں کی طرح کیڑے چھڑکتا ہوا جارہا تھا۔

اسے چھکڑے پر لادا گیا تو اس کی جڑ اوپر تھی اور شاخیں زمین پر رگڑ کھا رہی تھیں۔ دروازے اور کھڑکیوں سے سر نکلے ہوئے تھے، جیسے مٹی کی دیواروں پر پھولدار میخیں ٹھونک دی گئی ہوں۔

میں دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے کمرے میں بیٹھ رہا۔ ماں بید کی طرح تھرتھرا رہی تھی، آپ ہی آپ بل کھا رہی تھی اور چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ ہٹی کٹی عورت نے اسے چھاپ کر اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ باہر سے کیڑے اور چیونٹیاں کمروں کی طرف بڑھتی چلی آ

رہی تھیں۔ چیونٹیاں پہلے پہنچیں اور دیواروں اور کھڑکیوں پر ہوتی ہوئی او پر چڑھنے لگیں۔

اچانک میں نے دیکھا۔ صحن کے بیچ میں، جہاں پر درخت ہوا کرتا تھا، جہاں پر اب اینٹیں چن دی گئی تھیں، جہاں پر زمین تھوڑی اونچی ہوگئی تھی، ٹھیک اس جگہ، میں نے بڑے میاں کو دیکھا۔ وہ سلاخ کی طرح سیدھے کھڑے تھے، اور انھوں نے دونوں ہاتھ پھیلا رکھے تھے اور ان کے سارے بدن پر کیڑے رینگ رہے تھے، اور میں نے پھر وہی جہنمی آواز سنی:

ٹپ... ٹپ... ٹپ...

❄

درخت جا چکا تھا اور اپنی جگہ کیڑے اور چیونٹیاں چھوڑ گیا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرا مکان گرنے ہی والا ہے۔ اس کی ایک ایک چیز بوسیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کیڑے اس کے کھمبوں کے نیچے سے اور نیو کے اندر سے کلبلاتے ہوئے اوپر آ رہے ہیں۔ دیواروں میں، چھتوں میں، کھڑکیوں میں، ہر جگہ کیڑے بجبجا رہے تھے۔ مکان گرنے والا تھا، بکھرنے والا تھا، ریزہ ریزہ ہونے والا تھا۔ وہ ہٹی کٹی عورت جس کے نیچے میری ماں چوزے کی طرح لرز رہی تھی اور چیخ رہی تھی، اس کو بھی کیڑے اندر ہی اندر کھائے جا رہے تھے۔ میں بھی اور میری ماں بھی، دونوں ریزہ ریزہ بکھرے جا رہے تھے۔

ہم سب کیڑوں کے مل جانے سے بنے تھے، اور اب کیڑے الگ الگ ہو رہے تھے اور باہر ٹیک رہے تھے، اور چیونٹیاں انھیں کھینچے لیے جا رہی تھیں۔ اور آخر ہم بھی اسی درخت کی طرح چیونٹیوں کے گوداموں میں ذرہ ذرہ انبار ہو رہے تھے۔ ہمارا گھر اپنی تمام یادوں سمیت، تمام قہقہوں، سسکیوں، الجھنوں، کڑوی باتوں، میٹھے بولوں کی نامحسوس جھلکیوں سمیت، اپنی تنہائی بھری فضا سمیت چلا جا رہا تھا، ہاتھ سے نکلا چلا جا رہا تھا۔

مجھے خیال ہوا میں نے بیکار ہی میں دروازے اور کھڑکیاں بند کر رکھی ہیں۔ وہ آ کے رہیں گے، وہ کمروں کے اندر ہی موجود ہیں، وہ ہمارے رگ رگ میں اتر چکے ہیں۔ وہ ہم کو آہستہ آہستہ، ذرہ ذرہ، کھا رہے ہیں۔ وہ ہم کو اندر ہی اندر گلا رہے ہیں۔

میں اٹھا۔ میں نے کرسی اٹھائی اور پوری طاقت سے کھڑکی پر دے ماری، اور خود کو کمرے کے باہر ٹپکا دیا۔

❄❄

(فارسی عنوان: ''مرگ'')

نیر مسعود

فارسی کہانی : ایک مختصر تعارف

ایرانی ادب میں خیالات کے اظہار اور مفہوم کی وضاحت کے لیے قصہ کہانی سے کام لینے کی روایت زیادہ تر ہندوستان کی مرہون منت ہے۔ پنچ تنتر کے پہلوی اور فارسی ترجموں نے اس روایت کو مستحکم کیا اور اس کے بعد سے فارسی کی غیر افسانوی تالیفوں میں بھی حکایتوں کا استعمال کثرت سے ہونے لگا۔ قابوس نامہ، مرزبان نامہ، سیاست نامہ وغیرہ حکایتوں کے اہم مخزن اور گلستان اور اخلاقِ محسنی وغیرہ ان کا نقطۂ عروج ہیں۔ اخلاقِ محسنی کے مصنف ملّا حسین واعظ کاشفی نے پنچ تنتر کی کہانیوں کو انوار سہیلی کے نام سے رنگین فارسی نثر میں لکھا جس کا اردو میں سب سے اچھا ترجمہ فقیر محمد خاں گویا نے بُستانِ حکمت کے نام سے کیا۔ اخلاقِ محسنی اور گلستان وغیرہ کے بھی اردو میں ترجمے ہوئے۔ ان کتابوں کے اثر سے اردو میں بھی کہانی کا رواج عام ہوا؛ گویا ہندوستانی کہانی ایران کا چکر لگا کر ہندوستان کی اردو میں واپس آ گئی۔

بیسویں صدی آتے آتے روایتی حکایتوں کا زمانہ ختم ہوا اور ان کی جگہ نئے طرز کے مختصر افسانے نے لے لی۔ ایران میں میر محمد حجازی اس نئے دور کا سب سے ممتاز ناول نویس اور افسانہ نگار تھا۔ حجازی اور اس کے ہم عصر پیچ اور ابہام سے خالی، خطِ مستقیم پر سفر کرنے والے، جذبات آمیز اور پُراثر افسانے لکھتے تھے جن کا مرکزی خیال بہت واضح ہوتا تھا، بلکہ کبھی کبھی تو یہ افسانہ نگار افسانے کے آخری جملوں میں اس کے مرکزی خیال یا افسانے سے برآمد ہونے والے نتیجے

کی نشاندہی بھی کر دیتے تھے (یہ غالباً حکایتوں کا بچا کھچا اثر تھا)۔

حجازی وغیرہ فارسی فکشن کے اُس جدید دور کے نمائندے تھے جس کے آغاز سے پہلے ہی اردو ادب اپنے معاصر ایرانی ادب سے بے نیاز، اور شاید بے خبر بھی، ہو چکا تھا۔ ابھی تک اردو کے بیشتر اصناف نے اپنے سامنے ایرانی فارسی اصناف کو ماڈل کے طور پر رکھا تھا لیکن اب وہ اپنے طور پر آگے بڑھ رہا تھا، یا نئے ماڈلوں کے لیے ایران کے بجائے مغرب کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اردو فکشن کے سامنے سے بھی ایرانی ماڈل ہٹ گیا تھا، لیکن دورِ جدید کے ان ابتدائی مرحلوں میں بھی اردو اور فارسی فکشن ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھے، اس لیے کہ اب دونوں کے سامنے فکشن کا مغربی ماڈل آ گیا تھا جس کے زیرِ اثر دونوں زبانوں کے افسانوی ادب میں غیر معمولی اور تیز رفتار پیش رفت شروع ہو گئی تھی۔ ایران میں اس پیش رفت کی اہم ترین علامت صادق ہدایت ہے۔

صادق ہدایت ایرانی فکشن کا سب سے بڑا نام ہے۔ اس نے مغربی ادبیات کا وسیع مطالعہ اور کئی ملکوں کی سیر کی تھی۔ اسی کے ساتھ اس کو قدرت کی طرف سے قصہ گوئی کی زبردست صلاحیت ملی تھی۔ بوفِ کور (اندھا اُلو) اس کا شاہکار ناول (یا طویل افسانہ؟) ہے جس نے مغربی دنیا کو بھی اس قدر متاثر کیا کہ میکائیل بارڈ (Michael Beard) نے ایک پوری کتاب Hedayat's Blind Owl as a Western Novel لکھی اور اس میں بڑے تفصیلی تجزیے کر کے اس نتیجے پر پہنچا کہ بوفِ کور صرف فارسی نہیں بلکہ عالمی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہدایت ہندوستان اور اس کی روایات سے خاصا متاثر تھا جس کا اظہار اس کی تحریروں میں بھی ہوا ہے۔ بوفِ کور کا مرکزی کردار بنارس کے ایک مندر کی رقاصہ کا بیٹا ہے اور اس انوکھی داستان میں ہندوستان ایک مرموز، سحر آمیز سرزمین کے طور پر اُبھرتا ہے۔ فرانسیسی زبان میں بھی ہدایت کی ایک کہانی Lunatique کا محلِ وقوع بمبئی اور کردار ہندوستانی ہیں۔ اس کہانی میں ہدایت نے کچھ مکالمے اردو زبان میں بھی لکھے ہیں۔

ہدایت نے کافکا، سارتر وغیرہ کے فارسی میں ترجمے بھی کیے اور اس کو صحیح معنی میں ایرانی

فکشن کی عہد ساز شخصیت کہا جا سکتا ہے، اور یہ شخصیت جنون کی حد تک غیر معتدل اور نفسیاتی گتھیوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ شخصیت بہ آسانی 'مریضانہ' کہی جا سکتی تھی، اور اس کے افسانے اسی شخصیت کا نقش ہیں۔ یہ فارسی افسانے کے حق میں نیک فال تھی، اس لیے کہ ابھی تک یہ افسانہ معتدل اور صحت مند ذہنوں کے قبضے میں تھا۔ ہدایت کی قلمرو میں پہنچ کر اس نے ایسے ایسے روپ اختیار کیے جن کی فارسی ادبیات کی رچی ہوئی روایت کا تربیت یافتہ ذہن مانوس نہیں تھا لیکن مانوس ہونے پر تیار تھا، اور مانوس ہوا۔ اور دیکھتے دیکھتے فارسی افسانے کا افق وسیع ہونے لگا۔ لیکن خود ہدایت اپنی شخصی الجھنوں اور افتادِ طبع کے جال میں پھنستا چلا گیا۔ اس نے کئی مرتبہ خودکشی کی کوشش کی اور آخر گیس سے اپنا دم گھونٹ کر مرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سینتالیس اڑتالیس سال کی عمر میں اُس کا اس طرح اٹھ جانا ایرانی ادب کا بڑا سانحہ تھا، لیکن وہ اپنی زبان کو فکشن کا جو معیار دے گیا اس کے اثر سے ایران میں عمدہ افسانہ نگاروں کی ایک پوری کھیپ تیار ہو گئی۔ ایرانی رسالوں نگین، سخن وغیرہ میں تکنیک کے تجربوں اور اچھوتے موضوعات والے افسانوں کو بطورِ خاص جگہ دی جانے لگی۔ اس خصوص میں مجلہ سخن، تہران، قابلِ ذکر ہے جس میں تواتر کے ساتھ بہت اچھے فارسی افسانے شائع ہوتے رہے۔ جمال میر صادقی، عباس حکیم، بابا مقدم، غلام حسین ساعدی، غلام حسین نظری وغیرہ سخن کے ممتاز لکھنے والے تھے جن میں کئی کے تراجم مغربی زبانوں میں بھی ہوئے۔ اس کے علاوہ جلال آلِ احمد، اور ان کی بیوی سیمین دانشور، صمد بہرنگی وغیرہ کو بھی مغرب نے اعتنا کی نظر سے دیکھا۔ منیر و روانی پور، اسماعیل شاہرودی، محسن دامادی، فریدون تنکابنی اور متعدد دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی فارسی فکشن میں اپنے انفرادی نقوش قائم کیے۔

جدید فارسی افسانے کے مقابل جب ہم اپنے اردو افسانے کو رکھتے ہیں تو دونوں میں مماثلتیں زیادہ، مغائرتیں کم نظر آتی ہیں۔ فنی حرفت کے لحاظ سے بھی اردو افسانہ فارسی افسانے سے پیچھے نہیں ہے، لیکن فارسی افسانے میں تنوع اردو افسانوں سے شاید کچھ زیادہ نکلے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایرانی افسانہ نگار ہمارے مقابلے میں عالمی ادبیات سے زیادہ آشنا ہیں۔ اہل

ایران مغربی فکشن کے قریب قریب ہر شاہکار کو، اور دوسرے ملکوں کے بھی اہم افسانوں کو، اپنی زبان میں منتقل کر لیتے ہیں (اردو افسانہ نگاروں میں بھی پریم چند، کرشن چندر، بلراج مین را وغیرہ کی بعض چیزوں کے فارسی ترجمے چھپے ہیں)۔ ترجمے کے میدان میں وہ ہم سے بہت آگے ہیں، اور جب ایران کے مقابلے میں ہم اپنے یہاں تراجم کی صورت حال پر نظر کرتے ہیں تو سخت احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے۔ تراجم سے اس غیر معمولی شغف کا مثبت اثر لازماً ایرانی فکشن پر اردو سے زیادہ پڑا ہے۔

فارسی اور اردو افسانے میں سب سے زیادہ فرق استعمالِ زبان کا نظر آتا ہے۔ ایرانی افسانہ نگار بول چال کی زبان اور عوامی تلفظ کو ہم سے بہت زیادہ بے تکلفی کے ساتھ تحریر میں لاتے ہیں۔ وہ الفاظ کی لغوی ہیئت کے علاوہ اس ہیئت کو بھی استعمال کرتے ہیں جو زبان سے ادا ہوتی ہے، مثلاً 'میشوذ' کی جگہ 'میشہ'، 'بیایند' کی جگہ 'بیان'، 'را' کی جگہ صرف 'و' کی آواز۔ ہمارے یہاں 'حضرت' کی جگہ 'حضت' کے قبیل کی مثالیں خال خال ملیں گی، لیکن فارسی افسانوں میں محلی لہجوں اور لغاتِ عامیانہ کا استعمال اتنا عام ہے کہ ان کی فرہنگیں تیار کر لی گئی ہیں۔ اور زبان کے ساتھ یہ آزادانہ رویہ ان کے یہاں صرف مکالموں تک محدود نہیں ہے بلکہ اسی انداز کے بیانیے کے ساتھ پورے پورے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔

فارسی افسانوں کو پڑھتے ہوئے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ایرانی افسانہ نگار فطرت کے جتنے قریب ہیں اتنے ہم نہیں ہیں۔ موسموں اور فضاؤں کی کیفیات کا بیان اُن کے یہاں بہت جاندار ہوتا ہے اور یہ عناصر ان کے افسانے میں اہم کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ درختوں میں بھی ایرانی افسانہ نگاروں کی دلچسپی ہم سے زیادہ ہے۔ بابا مقدم کے افسانوں میں ''لاشہ مار'' (''مردہ سانپ'') کا دارِ زعفران، ''گلہای زرد و کفشہای میخدار'' کا کہنہ درخت، منوچہر خسروشاہی کے ''مرگ'' کا کیڑوں بھرا درخت اور دوسرے بہت سے افسانوں کے پیڑ پھول پودے انسانی کرداروں سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔

فطرت سے اسی علاقہ مندی کا اثر یہ بھی ہے کہ ایران کے افسانہ نگاروں کے یہاں جانور ہم سے زیادہ ملتے ہیں۔ اُن کے یہاں ہمارے رفیق حسین کا جواب تو پیدا نہیں ہو سکا، لیکن جانوروں کو مرکزی کردار بنا کر لکھے جانے والے افسانے فارسی میں اردو سے بہت زیادہ ہیں۔ صادق ہدایت کا ''سگ ولگرد'' (''سگِ آوارہ'') عالمی شہرت کا افسانہ ہے۔ صادق چوبک کا ''آتما، سگِ من'' اس سے بھی کچھ بہتر افسانہ ہے۔ فریدہ رازی کے ''گربہ ام را کشتم'' (''بلّی کا خون'') اور ہدایت کے ''سہ قطرہ خون'' میں بلی کو افسانے کا اہم کردار بنایا گیا ہے۔ بابا مقدم کے ''باران واشک'' (''بارش اور آنسو'') میں گھوڑے اور ''قفسہا'' (''پنجرے'') میں پرندے عمدہ المیہ افسانوں کے انسانی کرداروں کی طرح اثر کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے، اور عمومی طور پر بھی، ایرانی افسانوں کا مطالعہ اردو کے قارئین اور افسانہ نگاروں کے لیے دلچسپی اور فائدے سے خالی نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ فارسی کے عمدہ اور زیادہ سے زیادہ افسانوں کو اردو میں منتقل کیا جائے۔

اردو میں فارسی افسانوں کے ترجموں کی تعداد اطمینان بخش نہیں ہے۔ صادق ہدایت کے ترجمے نسبتاً معقول تعداد میں ہوئے ہیں اور ان کا ایک مجموعہ بھی سگِ آوارہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ سید حامد حسن قادری مرحوم نے بھی فارسی افسانوں کے تراجم کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ کچھ ترجمے نصابی ضرورتوں کے تحت بھی ہوئے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اردو میں تراجم کے ذریعے فارسی افسانوں کی نمائندگی اُتنی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ زیرِ نظر مجموعہ اسی کمی کی تلافی کی ایک کوشش ہے جس کی تحریک میرے کچھ عزیز دوستوں کی طرف سے ہوئی تھی۔

۱۹۶۹ء میں عابد سہیل کی فرمائش پر ان کے رسالے کتاب کے لیے میں نے شین پرتو کے افسانے ''بہائے عشق'' کا ترجمہ اس لیے کیا کہ اسے پڑھ کر منٹو کا افسانہ ''سرکنڈوں کے پیچھے'' یاد آتا ہے۔ 1971 میں شمس الرحمن فاروقی کے لیے بابا مقدم کے افسانے ''قفسہا'' کا ترجمہ (''پنجرے'') کیا جو شب خون میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ کراچی کے دو نوجوان دوستوں اور اردو

کے ممتاز مترجموں آصف فرخی اور اجمل کمال کو بہت پسند آیا اور دونوں مجھ سے مزید ترجموں کے طالب ہوے۔ اجمل کمال نے جب اپنا رسالہ آج باقاعدگی کے ساتھ نکالنا شروع کیا تو اس کے لیے مجھ سے جدید فارسی افسانوں کے ترجموں کی فرمائش کی۔ میں نے تین ترجمے انھیں بھیجے جو خزاں (ستمبر) 1990 کے آج میں شائع ہوے۔ اجمل نے ہدایت کے بوفِ کور کا اردو میں بہت اچھا ترجمہ کیا ہے۔ ان کا ارادہ ہوا کہ آج کے ایک دو شمارے فارسی افسانوں کے ترجموں کے لیے وقف کیے جائیں۔ مترجموں کی فہرست میں مجھ کو بھی شامل کر کے انھوں نے کراچی سے مجھے فارسی افسانوں کے مجموعوں پر مجموعے (جو وہ ایران سے لے کر آئے تھے) بھیجنا شروع کیے۔ ان کے لیے میں نے نو اَور افسانوں کے ترجمے کیے۔ غلام حسین ساعدی کے ''گدا'' کا ترجمہ (''بھکاری'') شب خون میں شائع ہو چکا تھا۔ مصنف نے اسے 'نمایش نامۂ بی گفتار' (خاموش ڈراما) قرار دیا ہے، لیکن ہیئت کے اعتبار سے یہ صیغۂ حال میں لکھا ہوا افسانہ بھی ہے، اس لیے اسے بھی شامل کر کے کل پندرہ ترجمے ہو گئے جو ایک مجموعے کے لیے کافی معلوم ہوے۔

ترجمے کے لیے افسانوں کے انتخاب میں صرف یہ معیار پیش نظر رکھا گیا ہے کہ افسانہ اچھا ہو اور اس کا ترجمہ نسبتاً آسان ہو۔ کئی بہت اچھے افسانے محض مترجم کی کم استعدادی کی وجہ سے انتخاب میں شامل نہ ہو سکے۔ ان محروموں میں ساعدی کا افسانہ ''فقیر'' (''روضے والی'') بھی تھا جسے چھوڑنے پر میرا دل راضی نہ ہوتا تھا، لیکن فارسی افسانوں کی جس خصوصیت یعنی بول چال کی زبان کا اوپر ذکر آیا وہ ترجمے کی راہ میں حائل تھی۔ کسی طرح افسانے کا ترجمہ تو کر لیا لیکن پچیس تیس لفظ اور فقرے ایسے باقی رہ گئے جن کا مطلب فرہنگوں کی ورق گردانی سے بھی حل نہیں ہوا۔ اپنے ایرانی دوست آقاے ابراہیم حسنی کا ممنون ہوں کہ ان کی مدد سے آخر یہ مشکل آسان ہوئی۔

فارسی کی ان کہانیوں کو اردو روپ دینے میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ترجمے کی زبان اردو محاورے کے مطابق ہو، لیکن اتنی مطابق بھی نہ ہو کہ ایرانی کہانی پر ہندوستانی کہانی کا گمان ہونے لگے۔

لکھنے والوں کا تعارف

اسماعیل فصیح

موجودہ فارسی فکشن کے ایک اہم نمائندہ اسماعیل فصیح 1935 میں تہران میں پیدا ہوئے۔ تہران میں اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1956 میں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے امریکہ چلے گئے۔ وہاں سے انگریزی ادب اور سائنس کے مضامین میں اسناد حاصل کرکے ایران واپس آئے اور 1963 میں ایران کی قومی آئل کمپنی (شرکت ملی نفت ایران) میں ملازمت اختیار کرلی۔ اس ملازمت میں ان کا کام زیادہ تر ابادان انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں تدریس پر مشتمل تھا۔ سترہ سال کی ملازمت کے بعد 1981 میں انھیں جبراً ریٹائر کردیا گیا۔ تب سے وہ تہران میں مقیم اور تصنیف کے کام میں مشغول ہیں۔

1968 میں فصیح کا پہلا ناول شرابِ خام شائع ہوا اور 1970 میں کہانیوں کے دو مجموعے خاکِ آشنا اور دیدار درہند چھپے۔ اس کے بعد شائع ہونے والی کتابوں میں فصیح کی کہانیوں کے دو مجموعے عقدو داستانہای دیگر (1978) اور نمادہای دشتِ مشوش (1990)، اور چھ ناول دلِ کور (1974)، داستانِ جاوید(1980)، ثریا در اغما (1983)، دردِ سیاوش (1985)، زمستانِ شصت و دو (1987) اور شہباز وجغدان (1990) شامل ہیں۔

فصیح کا مضمون The Status: A Day in the life of an Iranian Writer، جو 1987 میں تھرڈورلڈ ریویو میں شائع ہوا، انقلاب سے پہلے اور بعد کے زمانوں میں ایرانی ادیبوں کی صورت حال پر روشنی ڈالتا ہے۔

بابا مقدم

بابا مقدم رضا 1913 میں پیدا ہوے۔ قانون کے مضمون میں ڈگری حاصل کی اور فوج میں افسری کی۔ ان کی نسل کے دوسرے ادیبوں کی طرح ان کی تحریریں بھی تہران کے مجلہ سخن میں شائع ہوتی تھیں۔ وہ فارسی کے ان ادیبوں میں سے ہیں جو صادق ہدایت سے متاثر ہوے اور ان کی تحریروں میں اضطراب اور ناامیدی کی فضا چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے مجموعے عقاب تنہا (1958) کی کہانیوں کا محلِ وقوع فرانس ہے لیکن اگلے مجموعوں، بچہ ہای خدا (1966) اور اسب (1969)، کی کہانیاں پرانے تہران میں پیش آتی ہیں۔ بابا مقدم کی کہانیوں میں نادار لوگوں اور جانوروں کے تئیں گہری دردمندی پائی جاتی ہے۔ اپنی آخری دور کی کہانیوں میں انھوں نے سُرریئلزم اور کافکائی فضا کے تجربات بھی کیے۔ انھوں نے فرانسواز ساگاں، کافکا اور ژاں روسلو کی تحریروں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ان کی وفات 1987 میں امریکہ میں ہوئی۔

جمال میر صادقی

جمال میر صادقی 1933 میں تہران میں پیدا ہوے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ ہائی اسکول کی تعلیم پوری کرتے ہی انھوں نے تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا اور ساتھ ساتھ فارسی ادبیات کے میدان میں اعلیٰ تعلیم بھی جاری رکھی۔ 1950 کی دہائی کے آخری برسوں میں میر صادقی کی کہانیاں تہران کے ماہنامہ سخن میں شائع ہونا شروع ہوئیں اور پہلا مجموعہ شارذہ خانمِ چشم سبز 1962 میں چھپا۔ بعد میں انھوں نے اس مجموعے کا عنوان بدل کر مسافرہای شب کر دیا۔ اس کے بعد میر صادقی کی کہانیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوے جن کے نام یہ ہیں: چشم ہای من، خستہ (1966)، شبہایِ تماشا و گلِ رزد (1970) این سوی تل ہای شن (1974)، نہ آدمی نہ صدایی (1975)، دوالپا (1977) اور ہراس (1978)۔ 1979 کے انقلاب سے پہلے ان کے تین ناول درازنای شب (1970)، این شکستہ ہا (1971) اور شب چراغ (1977) شائع ہو چکے تھے۔

انقلاب کے بعد بھی میر صادقی کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں کہانیوں کا مجموعہ پشہ ہا و داستانہای دیگر (1989) اور ناول بادہا خبر از تغییرِ فصل میدادند (1985)، آتش از

آتش (1986) اور کلاغہا و آدمہا (1989) شامل ہیں۔

اسی دوران میر صادقی نے تنقید نگار کے طور پر بھی اپنا مقام پیدا کیا اور دو کتابیں عناصرِ داستان (1985) اور ادبیاتِ داستانی: قصہ، داستانِ کوتاہ، رُمان، بانگاہی بہ داستان نویسی معاصر ایران (1988) شائع کیں۔

میر صادقی کی بیوی میمنت میر صادقی شاعر اور تنقید نگار کے طور پر معروف ہیں۔

صادق ہدایت

صادق ہدایت کو متفقہ طور پر فارسی فکشن کا پہلا بڑا نام سمجھا جاتا ہے۔ وہ 1903 میں تہران کے ایک معزز اور متمول گھرانے میں پید ہوے اور وہاں کی اعلیٰ ترین درسگاہوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 1926 میں انھیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یوروپ بھیجا گیا لیکن انھوں نے اپنے چار سالہ قیام کو درسی تعلیم کی نذر کرنے کے بجائے یوروپی ادب اور آرٹ سے شناسائی پیدا کرنے میں صرف کیا۔ وہ 1930 میں تہران واپس آئے اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ زندہ بگور شائع ہوا۔ 1930 سے 1942 تک کا زمانہ ہدایت کی ادبی زندگی کا سب سے زیادہ ثمر آور دور تھا۔ یہ زمانہ ایران میں سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے بڑی تبدیلیوں کا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز پر شروع ہونے والی دستوری اصلاحات کی تحریک 1921 میں اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہ کر ختم ہو چکی تھی اور رضا شاہ اول کی آمرانہ بادشاہی کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ مگر مغربی فکر سے آشنائی ایرانی معاشرے کی بظاہر پُرسکون سطح کے نیچے بڑی لہریں پیدا کر رہی تھی۔ تہران لوٹنے کے بعد ہدایت کو چند ہم مذاق دوستوں کا ساتھ میسر آیا جن میں بزرگ علوی، مسعود فرزاد اور مجتبیٰ مینوی شامل تھے۔ یہ چاروں دوست — جنھیں فرزاد نے ازراہ مذاق ''مرد مان ربعہ'' کا نام دیا، اور یہ نام تہران کے ادبی حلقوں میں کسی حد تک مشہور بھی ہوا — ہر روز شام کا وقت اکھٹے گزارتے اور کتابوں اور خیالات کا آپس میں تبادلہ کرتے۔ مگر ہدایت طبعاً تنہا اور قنوطی تھے اور عملی سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے جبکہ ان کے ساتھی سیاسی طور پر سرگرم تھے۔ آخر 1937 میں بزرگ علوی کے قید کر دیے جانے کے بعد یہ گروپ منتشر ہو گیا۔ بارہ سال کے

اس عرصے میں ہدایت کی کہانیوں کے چار مجموعے سہ قطرہ خون (1932)، سایہ روشن (1933)، وغ وغ ساہاب (1933) اور سگ ولگرد (1942)، ایک طویل کہانی ''علویہ خانم'' (1933) اور ناول بوفِ کور (1937) شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف دوسرے موضوعات پر بھی کتابیں لکھیں جن میں تاریخی ڈرامے، طنزیہ خاکے (''قضیے'')، تنقیدی مقالے اور مغربی زبانوں کے فکشن کے ترجمے شامل ہیں۔ ہدایت نے کافکا کی شاہکار کہانی Metamorphosis کا ترجمہ ''مسخ'' کے نام سے کیا اور اس کے بارے میں ایک طویل تنقیدی مضمون بھی لکھا۔ کافکا کے علاوہ خیام سے بھی ان کو ایک طبعی مناسبت تھی۔ اس کے بارے میں ہدایت کا ایک طویل مقالہ ''ترانہ ہای خیام'' کے نام سے رباعیات خیام کے ایک نئے ایڈیشن میں مقدمے کے طور پر چھپا اور اس مقالے نے خیام کے مطالعے میں ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لی۔

ہدایت کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کا قدیم فارس کی تہذیب سے گہرا لگاؤ ہے۔ یوروپ سے واپسی پر انھوں نے پہلوی زبان کی باقاعدہ تحصیل کی اور کئی قدیم زرتشتی مخطوطوں کو فارسی میں منتقل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ 1937 کے لگ بھگ ہندوستان کے سفر کے دران انھوں نے بمبئی کے پارسیوں سے قدیم زرتشتی صحیفوں کا درس لیا تھا۔ وہ فارس کی ماقبل اسلام تہذیب کے بہت گرویدہ تھے اور ایران میں اسلام کی آمد کو عرب فتوحات کا نتیجہ اور ایرانی تمدن میں ایک خارجی عنصر کی آمیزش خیال کرتے تھے۔ ان کے تاریخی ڈرامے پروین دختر ساسان اور مازیار ان کے اسی جذباتی لگاؤ کا اظہار ہیں اور ادبی اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ اپنے زمانے کی مذہبی رسومیات پر ان کی شدید طنز آمیز تحریر توپ مرواری ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ یہ کتاب 1990 میں سویڈن سے شائع ہوئی۔

1941 میں دوسری جنگ عظیم کے دوران ایران پر اتحادی فوجوں کے تسلط اور رضا شاہ اول کی سبکدوشی کے بعد بیرونی طاقتوں کی مرضی سے اس کا بیٹا محمد رضا پہلوی تخت نشین ہوا۔ تب سے لے کر 1953 تک کا زمانہ ایران میں فکر و تحریر کی نسبتاً آزادی کا تھا۔ مگر اُس وقت تک ہدایت اپنے یاس آمیز طرز احساس کے باعث اپنے اردگرد کی ہر چیز سے متنفر ہو چکے تھے۔ تب سے لے کر اپنی موت تک کے عرصے میں ہدایت کی کہانیوں کا صرف ایک مجموعہ ولنگاری، ایک طویل کہانی ''حاجی آقا'' اور چند طنزیہ خاکے شائع ہوئے۔

زندگی سے بیزاری، موت کی کشش اور خودکشی کا میلان ہدایت کی گنجلک شخصیت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ پیرس میں اپنے اولین قیام کے دوران انھوں نے دریائے سین میں کود کر جان دینے کی کوشش کی تھی، اور ایک اور موقعے پر تریاق کھا کر۔ اس تاریک طرزِ احساس کی وجہیں ان کے ذاتی احوال میں بھی تلاش کی گئی ہیں اور اپنے وقت کے ایرانی معاشرے سے اس کی عدم مناسبت میں بھی۔ وہ رفتہ رفتہ ایران میں جینے مرنے سے بالکل بیزار ہو چکے تھے اور ادب سے مسرت اٹھانے کی حس بھی کھو بیٹھے تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں جا بسنے کا ارادہ کیا لیکن چند مہینوں سے زیادہ وہاں نہ رہ سکے۔ 1950 میں وہ فرانس چلے گئے اور اپریل 1951 میں پیرس میں گیس سے دم گھونٹ کر خودکشی کر لی۔

صادق ہدایت نے فارسی میں اپنے بعد آنے والے افسانہ نگاروں پر گہرے اثرات مرتب کیے اور اس صنف کی جڑیں فارسی ادب میں مضبوط کرنے میں اس کا بہت اہم حصہ ہے۔ ہدایت نے ''زبانِ عامیانہ'' کو ادبی مقصد کے لیے کام میں لانے کی طرح ڈالی جو ایک ادبی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

صادق ہدایت کے معروف ناول بوف کور اور منتخب کہانیوں کا بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو میں بذل حق محمود نے ہدایت کی کہانیوں کا انتخاب اور ترجمہ کیا جو کتاب کی صورت میں سگِ آوارہ کے عنوان سے 1978 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ بوف کور (ترجمہ: اجمل کمال) پہلی بار 1984 میں آج کی کتابیں، کراچی، کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔

غلام حسین ساعدی

جلال آلِ احمد کے بعد آنے والے فارسی افسانہ نگاروں میں غلام حسین ساعدی کا نام بہت ممتاز ہے۔ ساعدی جلال کے بہت قریب تھے اور ان سے متاثر بھی، لیکن انھوں نے ایک اعلیٰ درجے کے ادیب کے طور پر اپنا منفرد اسلوب وضع کیا جس پر کسی کی چھاپ نہیں ہے۔ کہانیوں اور ناولوں کے علاوہ ساعدی نے ''گوہر مراد'' کے قلمی نام سے متعدد ڈرامے بھی لکھے اور کہا جاتا ہے کہ فارسی ڈراما نویسی میں ان کا کوئی مدِمقابل نہیں ہے۔ وہ ایک اہم ادبی رسالے **الفبا** کے بانی اور مدیر بھی تھے جس کے چھ شمارے 1973 اور 1976 کے درمیانی عرصے میں شائع ہوئے۔

ساعدی 1935 میں تبریز، آذربائیجان، میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ وہ پڑھے لکھے

آذربائیجانی ترکوں کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے طالب علمی کے دن وہ تھے جب ڈاکٹر مصدق نے ایرانی قومیت پر اصرار کرتے ہوئے تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیا تھا۔ بہت سے اور طالبعلموں کے ساتھ ساعدی بھی سیاسی سرگرمیوں میں شامل ہو گئے۔ 1953 میں مصدق کی معزولی اور شاہ کی واپسی پر انھیں پہلی بار قید میں ڈالا گیا۔ یہ قید و بند کے ایک طویل سلسلے کی ابتدا تھی جس کا آخری موقع 1974 میں آیا۔

ساعدی پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے اور انھوں نے تہران یونیورسٹی سے نفسیاتی معالج کے طور پر اختصاص حاصل کیا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا زیادہ حصہ انھوں نے جنوبی تہران کے علاقے میں پریکٹس کرنے میں صرف کیا جہاں، ایران کی قدیم روایت کا پاس کرتے ہوئے، وہ مریضوں سے صرف اتنی ہی فیس قبول کرتے تھے جو وہ ادا کر سکتے ہوں۔ ایک معالج کے طور پر ان کے تجربات اور ایران کے گوشے گوشے کے سفر نے ساعدی کی طبیعت میں انسانوں کے واسطے ایک گہری دردمندی پیدا کر دی تھی جس کا اظہار ان کی تحریروں میں بہت خوبی سے ہوتا ہے۔

ساعدی ایک پرنویس ادیب تھے اور انھوں نے اپنی پچیس سالہ عملی زندگی میں تیس سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں ناول، کہانیوں کے مجموعے، ڈرامے اور مونوگراف شامل ہیں۔ ان کی پہلی تحریر 1953 کے لگ بھگ چھپی تھی۔ 1960 میں ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ شب نشینی باشکوہ شائع ہوا، اور 1970 کی دہائی کے آخر تک ان مجموعوں کی تعداد چھ تک پہنچ چکی تھی۔ ان مجموعوں میں عزاداران بَیَل (1964)، دندیل (1966)، واہمہ ہای بی نام ونشان (1967)، ترس ولرز (1968) اور گور وگاہوارہ (1972) شامل ہیں۔ 1968 میں ان کا ناول توپ بھی شائع ہوا۔

ساعدی 1978 میں ایران سے باہر آ کر پھر کبھی واپس نہ گئے۔ انھوں نے پیرس میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں 1985 میں انتقال کیا۔

فریدون تنکا بنی

فریدون تنکا بنی ''آموزگار'' 1937 میں کیسپین کے ساحلی قصبے تنکابن میں پیدا ہوئے، فارسی ادبیات

میں یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم پائی اور پیشے کے اعتبار سے مدرس ہیں۔ اپنی نسل کے ایک 'معتبد' (کمیٹڈ یا engage) ادیب کے طور پر انھوں نے کئی بار سنسر شپ کی حدوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ 1968 میں وہ ایرانی ادیبوں کی انجمن قائم کرنے والوں میں شامل تھے اور اس کے بعد کے برسوں میں قید بھی کیے گئے۔ تنکابنی نے 1977 میں تہران کے گوئٹے انسٹیٹیوٹ میں منعقد کی گئی ''شاعری کی شاموں'' میں نمایاں طور سے حصہ لیا۔

تنکابنی کی پہلی مطبوعہ تحریر ایک طویل کہانی ''مردی در قفس'' تھی جو 1961 میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں: اسیرِ خاک (1962)، پیادہ شطرنج (1965)، ستارہ ہای شب تیرہ (1968) یادداشت ہای شہرِ شلوغ (1969)، راہ رفتن روی ریل (1977)، سرزمینِ خوش بختی (1978) اور میانِ دوسفر (1978)۔ ان کی تحریروں کا ایک مجموعہ دہ داستان ونوشتہ ہای دیگر 1978 میں کیلیفورنیا سے شائع ہوا۔

تنکابنی نے 1979 میں اپنے ایک مطبوعہ مضمون میں اپنی تحریروں کے سنسر کیے جانے کی شکایت کی۔

محسن دامادی

محسن دامادی 1959 میں کرمان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا لیکن فلموں کے مصنف اور ہدایتکار کی حیثیت سے زیادہ معروف ہوئے۔

آج کی کتابیں

کہانیاں

آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں	سید رفیق حسین	Rs. 375
عطرِ کافور	نیر مسعود	Rs. 80
نربدا اور دوسری کہانیاں	اسد محمد خان	Rs.180
خطِ مرموز	فہمیدہ ریاض	Rs.100
ایک اور آدمی	حسن منظر	Rs.85
عاقبت کا توشہ	نکہت حسن	Rs.85
دور کی آواز	فیروز مکرجی	Rs.150
صحرا کی شہزادی	سکینہ جلوانہ	Rs.120

کہانیوں کے ترجمے

ایرانی کہانیاں	انتخاب اور ترجمہ: نیر مسعود	Rs.90
عربی کہانیاں	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 1)	ترتیب اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 2)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 3)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
کارل اور اینا	(منتخب ترجمے) محمد سلیم الرحمن	Rs.80
گم شدہ خطوط	(منتخب ترجمے) محمد عمر میمن	Rs.90
مہرِ سکوت	(منتخب ترجمے) زینت حسام	Rs.120
نگی منجارو کی برفیں	(منتخب ترجمے) محمد خالد اختر	Rs.120

انتخاب

منتخب تحریریں	گابریئل گارسیا مارکیز	ترتیب: اجمل کمال	(زیرطبع)
منتخب تحریریں	نرمل ورما	ترتیب: اجمل کمال	Rs.280
منتخب کہانیاں	ویکوم محمد بشیر	ترتیب: مسعودالحق	Rs.180
پریم وانی	میرابائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395

ناول

بیس سو گیارہ	محمد خالد اختر	Rs. 70
گنگا جمنی میدان	اختر حامد خاں	Rs.120
دائرہ	محمد عاصم بٹ	Rs.100
نمبردار کا نیلا	سید محمد اشرف	Rs.60

ناولوں کے ترجمے

تمس	بھیشم ساہنی	ترجمہ: شہلا نقوی	Rs.180
قلبِ ظلمات	جوزف کونریڈ	ترجمہ: محمد سلیم الرحمن	Rs.80
بوفِ کور	صادق ہدایت	ترجمہ: اجمل کمال	(زیرطبع)
خیمہ	میرال طحاوی	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.75
نوکر کی قمیض	ونود کمار شکل	ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال	Rs.100
پہلی بارش	خولیولیاماز اریس	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.95
سرزمین مصر میں جنگ	یوسف القعید	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.125
درخت نشین	اتالو کلوینو	ترجمہ: راشد مفتی	Rs.175
شہزادہ احتجاب	ہوشنگ گلشیری	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.70
اِنگی کے دیس میں	ولاس سارنگ	ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال	Rs.150
امید اور دوسرے خطرناک مشاغل	لیلیٰ العلمی	ترجمہ: محمد عمر میمن	Rs.100

شاعری

پریم وانی	میرابائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کلیات اختر الایمان	اختر الایمان	ترتیب: سلطانہ ایمان، بیدار بخت	Rs.350
مٹی کی کان	افضال احمد سید	(کلیات)	Rs.500
روکوکو اور دوسری دنیائیں	افضال احمد سید		Rs.50
آدمی کی زندگی	فہمیدہ ریاض		Rs.70
ساری نظمیں	ذی شان ساحل	(کلیات)	(زیرِ طبع)
جنگ کے دنوں میں	ذی شان ساحل		Rs.125
ای میل اور دوسری نظمیں	ذی شان ساحل		Rs.150
نیم تاریک محبت	ذی شان ساحل		Rs.100
رات	سعید الدین		Rs.50
سائے چراغ کے	احمد عظیم		Rs.150
مٹی کا مضمون	فرخ یار		Rs.150
سویرے کا سیاہ دودھ	پاؤل سیلان	ترجمہ: آفتاب حسین	Rs.150
بارہ ہندوستانی شاعر	(انتخاب)	ترتیب: اجمل کمال	(زیرِ طبع)
خودکشی کے موسم	زاہد امروز		Rs.120

آج کی کتابیں

کراچی کی کہانی
(جلد اول و دوم)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.1100

ریت پر لکیریں
(انتخاب)
محمد خالد اختر
Rs.300

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

انیس
(سوانح)
نیر مسعود
Rs.375

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.150

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

لغاتِ روزمرہ
(تنقید و تحقیق)
شمس الرحمن فاروقی
Rs.250

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.280

کافکا کے افسانے
(افسانے)
نیر مسعود
Rs.70

دوسری زبانوں کے ناول

قلب ظلمات

جوزف کونریڈ

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

Rs.80

تمس

بھیشم ساہنی

ہندی سے ترجمہ: شہلا نقوی

Rs.100

نوکر کی قمیض

ونود کمار شکل

ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال

Rs.75

بوفِ کور

صادق ہدایت

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

(نیا ایڈیشن زیر طبع)

عمارتِ یعقوبیان

علاء الاسوانی

عربی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

(زیر طبع)

خندہ اور فراموشی کی کتاب

میلان کنڈیرا

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

(زیر طبع)

وجود کی ناقابل برداشت لطافت

میلان کنڈیرا

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

(زیر طبع)

کرپشن

طاہر بن جلون

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

(زیر طبع)

فارسی کہانیاں ۱

اسماعیل فصیح

بابا مقدم

جمال میر صادقی

شین پرتو

صادق ہدایت

غلام حسین ساعدی

فریدون تنکابنی

فریدہ رازی

محسن داماد ی

منوچہر خسروشاہی

ISBN 978-969-8380-92-2
Rs.250